معارف کا زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۵۰/روپے۔ فی شمارہ ۱۵/روپے۔

پاکستان میں سالانہ ۲۵۰/روپے — رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ۵۰۰/روپے — رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/روپے — رجسٹرڈ ڈاک ۷۰۰/روپے

ہندوستان میں ۸ سال کی خریداری صرف =/1,000 میں دستیاب ہے

نوٹ: (اوپر کی رقوم ہندوستانی روپے میں دی گئی ہیں۔)

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۲۷ اے، مال گودام روڈ، لوہا مارکیٹ، بادامی باغ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 ---- Phone: (009242) 7280916 5863609

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- رسالہ ہر ماہ کے پہلے ہفتہ میں شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کی ۲۰ تاریخ تک رسالہ نہ پہنچے تو اس کی اطلاع اسی ماہ کی آخری تاریخ تک دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہئے، اس کے بعد رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔
- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

مقالہ نگار حضرات سے التماس

- مقالہ صفحہ کے ایک طرف لکھا جائے
- حواشی مقالے کے آخر میں دیئے جائیں۔
- ماخذ کے حوالہ جات مکمل اور اس ترتیب سے ہوں: مصنف یا مؤلف کا نام، کتاب کا نام، مقام اشاعت، سن اشاعت، جلد یا جز اور صفحہ نمبر۔

عبدالمنان ہلالی جوائنٹ سکریٹری نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۱ ماہ ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ مطابق ماہ مئی ۲۰۰۸ء عدد ۵

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی
پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

۲۰۰۷ء میں پہلی جنگ آزادی کے ۱۵۰ سال پورے ہوئے، جدید ہندوستان کی تاریخ میں اس واقعہ کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر حکومت ہند نے اس کے شایانِ شان یادگاری تقریبات منانے کا فیصلہ کیا، یہ سلسلہ ۲۰۰۶ء کے اواخر سے شروع ہوا اور ہنوز جاری ہے، اس مناسبت سے دوسری تقریبات کے علاوہ ملک کے طول وعرض میں سمینار اور مجالس مذاکرہ منعقد کی گئیں اور اس کے مختلف پہلوؤں پر کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جارہی ہیں، ملک کو استعماری تسلط سے آزاد کرانے کے لیے مسلمانوں نے عدیم المثال قربانیاں پیش کیں لیکن اس سلسلہ میں جو لٹریچر سامنے آرہا ہے اس میں اس حقیقت کا بھرپور انعکاس نہیں پایا جاتا اور اس جدوجہد میں مسلمانوں نے جو غیر معمولی کردار ادا کیا اس کی دھندلی سی تصویر بھی ابھر کر سامنے نہیں آتی، دکھ کی بات یہ ہے کہ مسلمان خود بھی آگے بڑھ کے سامنے نہیں آئے اور ان کے آباء واجداد نے عزیمت اور قربانی کی جو داستان اپنے خون سے رقم کی تھی اس کو دنیا کے سامنے لانے کی کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی، مئی کے پہلے ہفتہ میں اردو کونسل کے تعاون سے رحمانی فاؤنڈیشن مونگیر میں اس موضوع پر ایک سمینار منعقد کررہی ہے، امید ہے کہ اس میں اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر خاطر خواہ توجہ دی جائے گی۔

جب یہ کشمکش اپنے نقطہ عروج پر تھی، ۳؍ جون ۱۸۵۷ء کو مجاہدین آزادی نے اعظم گڈھ کی جیل کے دروازے توڑ کر قیدیوں کو آزاد کرالیا، اسی دن ہندوستانی مسلمانوں کے معلم اول مولانا شبلی نعمانی کی ولادت ہوئی، چنانچہ ۲۰۰۷ء ہی میں اس خاکدان ارضی میں ان کے ورود مسعود کے بھی ۱۵۰ سال پورے ہوئے، مسلمانان برصغیر کی نشاۃ ثانیہ میں ان کا جو غیر معمولی کردار رہا ہے، اس کے پیش نظر حق تو یہ تھا کہ یہ سال ان کے جشن ولادت کے طور پر منایا جاتا، اس مناسبت سے ان کی یاد تازہ کی جاتی، ان کی خدمات کا ذکر کیا جاتا، ان کے شروع کیے ہوئے کاموں کو آگے بڑھانے کے لیے منصوبہ بندی ہوتی، ان مقاصد کے حصول کے لیے جو ان کو عزیز تھے، ایک نئے عزم اور حوصلہ کے ساتھ کوشش شروع کی جاتی اور ان کے مشن کے ساتھ تجدید عہد کیا جاتا لیکن بدقسمتی سے اس سلسلہ میں کچھ زیادہ نہیں ہوسکا اور وقت کا کارواں آگے بڑھ گیا، پروفیسر قمر رئیس صاحب نے اردو اکادمی دہلی کی طرف سے اور پروفیسر اختر الواسع صاحب نے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں اس مناسبت سے سمینار کا اہتمام کیا، اطلاعات کے مطابق دونوں سمینار بھرپور اور کامیاب رہے، امید ہے کہ جب ان میں پیش کیے جانے والے مقالات شائع ہوں گے تو شبلی شناسی کے

موضوع پر نئی جہات سامنے آئیں گی اور مولانا کے فکر وفن کی تفہیم کے نئے امکانات روشن ہوں گے۔

مولانا کے علمی اور فکری اکتسابات اور خدمات سے قدر دانان معارف بہ خوبی واقف ہیں، اس لیے اس کی تفصیل تحصیل حاصل کے مترادف ہوگی، اس سے قطع نظر مولانا کا ایک بڑا کارنامہ افراد سازی اور ادارہ سازی کے میدان میں ظاہر ہوا، انہوں نے متعدد اداروں کی تاسیس، تعمیر اور ترقی میں حصہ لیا، دارالمصنفین تو تمام تر ان کے تخیل کا نتیجہ ہے، اس دور کے مخصوص حالات میں اسلام، تاریخ اسلام اور اسلامی علوم، تہذیب وثقافت کے بارے میں جس طرح کے تحقیقی اور علمی لٹریچر کی ضرورت تھی، اس کی فراہمی کی صورت ناپید تھی، یہ کام جتنا اہم تھا اتنا ہی دشوار بھی تھا، ملک کے طول وعرض میں کوئی ایسا ادارہ موجود نہیں تھا جہاں باصلاحیت افراد کو تحقیق وتصنیف اور اس کے صبر آزما تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی تربیت دی جاسکے اور ان کے اندر علمی ذوق اور قرطاس وقلم کے وسیلہ سے اپنے نتائج تحقیق کو موثر اور دلنشین انداز میں پیش کرنے کا سلیقہ پیدا کیا جاسکے، جہاں کہیں مصنفین موجود تھے تو انہیں یکسوئی سے کام کرنے کے مواقع میسر نہیں تھے، چنانچہ دارالمصنفین کی تاسیس ایک تاریخ ساز واقعہ تھا اور اس کی کوئی مثال مسلمانان برصغیر کی تاریخ میں نہیں ملتی، غیر حکومتی سطح پر اس عہد میں اس نوعیت کے کسی کام کی مثال برصغیر سے باہر بھی ملنی مشکل ہے۔

گذشتہ تقریباً ایک صدی کے عرصہ میں دارالمصنفین نے علم وتحقیق کے میدان میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں وہ محتاج تعارف نہیں اور اہل علم ودانش ان کی نوعیت اور اہمیت سے آگاہ ہیں، اپنی تاسیس سے آج تک اس نے اپنے وسیع الاطراف لٹریچر کے ذریعہ نئی نسلوں کی رہنمائی اور تربیت اور ان کو فکری غذا بہم پہنچانے کے میدان میں جو کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں وہ اب تاریخ کا حصہ بن چکے ہیں، یہ کہنا شاید بے جا نہ ہو کہ جن مقاصد کے حصول کے لیے دارالمصنفین قائم کیا گیا تھا ان کی تکمیل میں وہ بڑی حد تک کامیاب رہا ہے، اس کے باوجود ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے اور اس کے بہت سے منصوبے تشنہ تکمیل ہیں، مزید برآں جن چیلنجز کا مقابلہ کرنے کے لیے یہ ادارہ قائم کیا گیا تھا وہ نہ صرف یہ کہ اب بھی موجود ہیں بلکہ اور شدت اختیار کرگئے ہیں، مغرب کی اسلام دشمنی نئی انتہاؤں کو چھو رہی ہے، خود اپنے وطن عزیز میں نئے مسائل اور چیلنجز کا سامنا ہے اور پوری سنجیدگی سے ان کی طرف توجہ کی ضرورت ہے، موجودہ زمانے میں ہندتو اور اس قسم کی دوسری اسلام دشمن طاقتوں کی الزام تراشیوں کا مدلل اور مسکت جواب فراہم کرنا بھی دارالمصنفین کی ذمہ داریوں میں ویسے ہی شامل ہے جیسے مستشرقین کی افترا پردازیوں

شذرات

کا جواب، نیا زمانہ بے شمار نئے مسائل لے کر آیا ہے اور ایک زندہ قوم ان سے صرف نظر نہیں کرسکتی، یہ اور بہت سے دوسرے کام ہیں جو دارالمصنفین کی ذمہ داریوں میں شامل ہیں، مجھے یقین ہے کہ انشاء اللہ حوصلہ و وسائل کی کمی کو اس راہ میں حائل نہیں ہونے دیا جائے گا۔

دارالمصنفین کو وہ فارغ البالی کبھی میسر نہیں آئی جس کی اس قسم کے اداروں کو ضرورت ہوتی ہے، کتنے منصوبے محض وسائل کی کمی کی وجہ سے روبہ عمل نہیں لائے جاسکے، ان تمام مشکلات اور مسائل کے باوجود یہاں کے محققین و مصنفین نے تحقیق و تصنیف کے میدان میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جو وسائل کے مالا مال بڑے بڑے ادارے نہیں کرسکے، ادھر گذشتہ کچھ برسوں میں گوناگوں اسباب کے باعث مسائل کی سنگینی میں غیر معمولی حد تک اضافہ ہوگیا ہے اور حالات ناقابل برداشت حد تک دشوار اور سخت ہوگئے ہیں، دارالمصنفین کا زیادہ تر دارومدار کتابوں کی فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی پر رہا ہے، پاکستان اور ہندوستان میں بڑے پیمانے پر مطبوعات دارالمصنفین کے مسروقہ ایڈیشنوں کی اشاعت سے ادارہ کی آمدنی پر نہایت ناخوش گوار اثر پڑا ہے، ابتدا میں دارالمصنفین کی کتابوں نے طباعت کا ایک نیا معیار قائم کیا تھا، پھر نہ صرف یہ کہ یہ ادارہ وقت کا ساتھ نہ دے سکا اور اپنے آپ کو طباعت کے میدان میں رونما ہونے والی تیز رفتار تبدیلیوں سے ہم آہنگ نہیں کرسکا بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ وہ خود اپنے قائم کردہ معیار کو باقی نہیں رکھ سکا، میرا یقین ہے کہ اس کے بانیوں کا اخلاص اور مقاصد کی عظمت ہی اسے اب تک باقی رکھے ہوئے ہے، مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب مرحوم اور ان کی زیر قیادت دارالمصنفین کے دوسرے رفقاء اور عملہ نے جس اخلاص، صبر، توکل اور قناعت سے اس ادارہ کی خدمت اور حفاظت کی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے اور یہ ہر شخص کے بس کی بات نہیں، اللہ انہیں اس کی بہترین جزا دے اور اعلا علیین میں صدیقین و شہدا کے ساتھ انہیں جگہ دے، آمین۔

حالات بلاشبہ نہایت سنگین ہیں اور اس وقت یہ ادارہ اپنی بقا کی جدوجہد میں مصروف ہے لیکن بہی خواہان دارالمصنفین اور قدر شناسان شبلی کی معمولی سی توجہ سے اس خزاں رسیدہ گلشن میں پھر سے بہار واپس آسکتی ہے اور اس مریض نیم جاں کی عروق مردہ میں پھر سے زندگی بخش لہو دوڑ سکتا ہے، شبلی و سلیمان کی اس گراں مایہ وراثت کی عظمت رفتہ کی بازیافت اور تعمیر نو کے لیے ایک ہمہ جہت مہم کا آغاز ہو چکا ہے، ہم آپ کو اس مہم میں شرکت کی دعوت دیتے ہیں۔

آناں کہ خاک را بہ نظر کیمیا کنند
آیا بود کہ گوشہ چشمے بما کنند

مقالات

۱۸۵۷-۵۸ء کے مجاہدین آزادی کے فرامین، اعلانیے اور حکم نامے - ایک مطالعہ

پروفیسر اقبال حسین

۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ یہ جنگ ہتھیاروں کے علاوہ اعلانیوں اور حکم ناموں کے ذریعہ بھی لڑی گئی تھی جو مجاہدین آزادی نے اردو اور ہندی زبانوں میں ہندوستان کے مختلف حصوں سے شائع کیے تھے، اس جنگ کی ابتدا بنگال آرمی کے فوجیوں نے کی تھی، بعد میں عوام اور خواص بھی مختلف وجوہات سے اس میں شامل ہوتے گئے، مجاہدین آزادی نے عام ہندوستانیوں کی مدد حاصل کرنے اور ان کی قومی حمیت کو بیدار کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً بہت سے اعلانیے جاری کیے تھے، افسوس ہے ان اعلانیوں کے اصل متن اب کم یاب ہیں، ۱۸۵۸ء میں یہ متن موجود تھے، انگریزی حکومت نے مجاہدین آزادی کے خلاف دائر کردہ مقدمات میں بہ طور ثبوت ان کے انگریزی تراجم پیش کیے تھے جو نیشنل آرکائیوز نئی دہلی، الہ آباد، یو۔پی آرکائیوز اور پنجاب اسٹیٹ آرکائیوز میں محفوظ ہیں، راقم الحروف نے نیشنل آرکائیوز، دہلی، یو۔پی آرکائیوز الہ آباد اور گورکھ پور کے سید حامد علی صاحب کے کتب خانہ میں موجود اعلانیوں کے کچھ اصل متن حاصل کیے ہیں، یہ زیادہ تر اردو زبان میں ہیں، تیس اعلانیے اردو اور ہندی زبانوں میں شائع شدہ ایک ساتھ ملے ہیں اور کئی اعلانیے فارسی میں ہیں، ان اعلانیوں کو ہم ان کے مضمون کی روشنی میں تین مختلف ادوار میں تقسیم کرسکتے ہیں، پہلے دور کے اعلانیوں میں عوام کو بڑے جوش اور عزم محکم کے ساتھ خطاب کرتے ہوئے انگریزوں کے جبر و استحصال کا ذکر کیا گیا ہے اور ان

ریٹائرڈ پروفیسر، شعبہ تاریخ، مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

کی بداعمالیوں، ہندوستانی مذاہب، ہندومت اور اسلام دشمنی کی وجہ سے ان کے استیصال پرزور دیا گیا ہے اور ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت بتلائی گئی ہے، دوسرے دور کے اعلانیوں میں ہندوستانی فوجیوں کی انگریزوں کے خلاف جنگ آزمائی، ہندو مسلم اتحاد پرزور، ایک دوسرے کے مذہب کے تحفظ، انگریزوں کے مکمل اخراج، نئی حکومت کے قیام کے بعد اچھے انتظامیہ، آزادی مذہب، بہتر زرعی اور مالی بندوبست وغیرہ کے وعدے ہیں، تیسرے دور کے اعلانیوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مجاہدین آزادی مشکلات سے دوچار تھے اور دفاعی جنگ لڑ رہے تھے، ان میں عوام اور خواص سے پرزور اپیل ہے کہ وہ دل و جان سے انگریزوں کے خلاف متحد ہوکر جنگ آزما ہوں اور اپنے اپنے دین کا تحفظ کرتے ہوئے دوسرے کے مذہب کی بھی انگریزوں سے حفاظت کریں، جنگ میں نمایاں کارکردگی کے لیے انعام و اکرام سے نوازے جانے کے بھی وعدے کیے گئے ہیں، ہندوستانی عوام کو یہ بھی آگاہ کیا گیا ہے کہ اگر انگریز دوبارہ برسر اقتدار آگئے تو ہندوستانیوں کا کیا حال ہوگا، اس مضمون کے لیے صرف چند فرامین، اعلانیوں اور حکم ناموں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ زیادہ تر اعلانیے اردو زبان میں ہیں، اگر ہم انیسویں صدی کے وسط میں شائع ہونے والے اخبارات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ان میں سے زیادہ تر ہندوستانی زبان اور فارسی رسم الخط میں شائع ہو رہے تھے[1] جو اردو زبان کے نام سے جانی پہچانی جاتی ہے، یہ اردو اخبارات زیادہ تر ہندوؤں کی ملکیت میں تھے اور وہی ان کے ایڈیٹر اور پبلیشر بھی تھے، اس سے یہ امر واضح ہے کہ اس وقت تک اردو زبان ایک مشترکہ قومی زبان کی حیثیت سے اپنی جگہ بنا چکی تھی جس کی نشو و نما اور فروغ میں ہندو اور مسلمانوں، دونوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، ۱۸۵۷-۵۸ء کے مجاہدین آزادی کے جاری کردہ اعلانیوں سے اس کی مزید توثیق ہوجاتی ہے، قطع نظر اس کے کہ اردو زبان، ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کی ترجمان تھی، آئیے اب ہم ذرا ان اعلانیوں، حکم ناموں اور فرامین پر بھی نظر ڈالتے چلیں جو اس مضمون کا اصل موضوع ہیں۔

پہلی جنگ آزادی کے اعلانیوں سے نہ صرف مجاہدین آزادی کے جذبات کا پتہ لگتا ہے بلکہ ان مسائل سے بھی آگاہی ہوتی ہے کہ وہ اتنی بڑی جنگ کیوں لڑ رہے تھے، انہوں نے عوام

ے کیا کیا وعدے کیے تھے اور ہندوستان کو انگریزوں کے چنگل سے آزاد کرانے کے لیے کیا جتن کر رہے تھے اور ملک کو آزاد کرانے کے بعد وہ اسے کن خطوط پر چلانا چاہتے تھے۔

اعلانیوں کے مطالعہ سے یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ مجاہدین آزادی جن کی قیادت زیادہ تر انگریزی فوج کے ہاتھوں میں تھی، انگریزوں کی مذہب دشمنی، اقتصادی استحصال[2]، نسلی امتیاز، حد سے زیادہ ٹیکسوں کا نفاذ، زرعی پالیسی، کساد بازاری، بے روزگاری اور ہندوستانی صنعتوں کے بتدریج زوال کو وہ گذشتہ ایک صدی سے برداشت کرتے رہے تھے، وہ بدحالی اور غربت کے باوجود خاموش اور صابر تھے لیکن ان کے صبر کا پیمانہ اس وقت چھلک گیا جب انگریزی حکومت کے زیر سایہ عیسائی مشنریز کے ذریعہ تبدیلی مذہب کی منصوبہ بند کوشش شروع کی گئی، یہ ایسا قدم تھا جس نے ان وفادار فوجیوں کو بھی انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر مجبور کر دیا، جنہوں نے ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام اور استحکام میں گذشتہ ایک صدی کے دوران نمایاں کردار ادا کیا تھا، ۱۰ رمئی ۱۸۵۷ء کو میرٹھ میں علم آزادی بلند کرنے کے بعد باغی فوجیوں کی ٹولی دہلی پہنچی اور ۱۱ رمئی ۱۸۵۷ء کو ان کا پہلا اعلانیہ شائع ہوا جس میں انہوں نے انگریزی حکومت پر الزام لگایا تھا:

"سب ہندو مسلمان رعایا اور ملازم ہندوستانیوں کو افسران فوج انگریزی مقیم دہلی و میرٹھ کی طرف سے دریافت ہووے کہ اب سب فرنگیوں نے ایکا کیا ہے کہ اول سب فوج ہندوستانی کو بے دھرم کر کے پھر رعایا کو بزور تدبیر کرسٹان کر لیں، چنانچہ ہم سب نے فقط دین کے واسطے مع رعایا کے اتفاق کر کے ایک کافر کو زندہ نہ چھوڑا اور بادشاہت دہلی اس عہد پر قائم کیا کہ فوج کمپنی فرنگیوں کو قتل کرے"۔[3]

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہ اعلانیہ بنگال آرمی کے فوجیوں نے جاری کیا تھا جن میں اکثریت اونچی ذات کے ہندوؤں کی تھی، اعلانیہ میں آگے یہ بھی کہا گیا تھا "اب لازم یہ ہے کہ جس کو کرسٹان ہونا دشوار ہووے، رعایا اور فوج ہر مقام کی ایک دل ہو کر ہمت کرے اور تخم ان کافروں کا باقی نہ رکھیں"۔[4]

اعلانیہ میں ہندو اور مسلمانوں کے مذہب کے تحفظ اور کرسٹانوں یعنی انگریزوں کے

خلاف شدید نفرت اور غصہ کا اظہار بے بنیاد نہ تھا، ہم عصر پادری اور مبلغ شیرنگ کے الفاظ میں:

"The whole land has been shaken by Missions to its innermost centre. The Hindoo treebles for his religion, the Mohammadan for his. Both religions seem to be crumbling away from beneath them". ۵

یہاں یہ امر قابل غور ہے کہ اعلانیہ میں انگریزوں کو کافر بتلایا گیا ہے جو عیسائی تھے، یعنی اہل کتاب تھے جن کے ساتھ مسلمان رشتہ ازدواج قائم کر سکتے تھے، تاہم اس لفظ کا استعمال مہاراجہ پیشوا نانا صاحب، رانی جھانسی، خان بہادر خاں، برجیس قدر، دودر پنت، بہادر شاہ ظفر، شہزادہ فیروز شاہ اور مولوی لیاقت علی کے اعلانیوں میں بار بار ہوا ہے اور انگریزوں کو نصاریٰ، کافر ہی کہا گیا ہے، نانا صاحب اپنے ایک اعلانیہ میں لکھتے ہیں:

"کافر انگریزوں نے اس حد تک مظالم، بدمعاشیاں، ناانصافیاں کی ہیں جن کی وجہ سے ایشور نے ان کافروں کو سزا دینے اور اکھاڑ پھینکنے، نیز سابق ہندو اور مسلمان حکومتوں کو دوبارہ قائم کرنے اور ملک کے تحفظ کے لیے مجھے متعین کیا ہے"۔ ۶

اعلانیوں کے انداز بیان سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ مجاہدین آزادی ہندو دھرم اور اسلام کے تحفظ کو کس قدر اہمیت دے رہے تھے اور اس فرض کو پورا کرنے کے لیے انہوں نے دھرم یدھ یا جہاد چھیڑ دیا تھا، اودھ میں ایک عام تصور یہ تھا کہ مذہب تو صرف دو ہی ہیں:

"دین تو دوئی دین، ہندو کا دھرم اور مسلمان کا ایمان"۔ ۷

مجاہدین آزادی ہندوستانی مذاہب کے متعلق جو جذبات رکھتے تھے وہ ان کے اس نعرہ سے بھی سمجھا جاسکتا ہے:

"وہ ایک پتا کے دوئی پتر، ایک ہندو ایک ترک، ان کا چولی دامن کا ساتھ"۔ ۸

درگا داس بندو پادیہائے، انگریزی فوج میں ملازم اور بریلی میں متعین ایک اور نعرہ کا ذکر کرتا ہے جو مجاہدین آزادی بریلی میں لگا رہے تھے:

"ہندو مسلمان ایک، رام رحیم ایک، شری کرشنا اللہ ایک"۔ ۹

یہ جذبات اور مذہبی رواداری ایک دن کی پیداوار یا ۱۸۵۷ء کے حالات کے پیش نظر سیاسی مصلحت پر مبنی نہیں تھے بلکہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ہندوستان میں صدیوں کے اتحاد، ایک ساتھ رہنے سہنے اور ایک دوسرے کے نظریات اور مذہبی افکار سمجھ لینے کے بعد پیدا ہوئے تھے، ہندوستانی عوام اور فوجی، اپنی اس اساس کو ہر قیمت پر بچانا چاہتے تھے، جس کو انگریزی حکومت نے عیسائی مشنریوں اور اپنی حکمت عملی سے خطرہ میں ڈال دیا تھا، رام بخش جنرل آف فرسٹ ڈویژن، منارام بریگیڈ میجر نے مجاہدین آزادی کے کیمپ سے مہاراجہ جنگ بہادر، نیپال کے نام اپنی عرضی میں لکھا تھا کہ ایک صدی تک ان کے مورثین نے انگریزوں کی ملازمت ایمان داری کے ساتھ انجام دی تھی جس کی بہ دولت وہ اس ملک کے مالک بن گئے لیکن انہوں نے ہمارے مذہبی جذبات کا خیال نہ کرتے ہوئے ایسے کارتوس بنائے جن میں سور اور گائے کی چربی کی آمیزش تھی جس کے ذریعہ ہمارا دھرم خراب کرنا چاہتے تھے، ان کی عرضی کی یہ سطریں قابل توجہ ہیں:

"اس سے پہلے بھی ہندوستان میں بہت سے بادشاہ گزرے ہیں لیکن کسی نے بھی ہمارا دھرم اور ایمان خراب کرنے کی کوشش نہیں کی، اگر کسی ہندو یا مسلمان کا مذہب ہی ختم ہو جائے تو پھر دنیا میں کیا رہ جائے گا"۔ ۱۰

یہی وہ جذبات تھے جس کی وجہ سے باغی انگریز فوج کے سپاہی بلالحاظ مذہب، دین اور دھرم کے تحفظ کے لیے انگریزوں سے محاذ آرا ہوئے تھے، وہ یہ سمجھتے تھے کہ انگریز جس مذہب کی پیروی کرتے ہیں وہ باطل ہے، وہ تین خداؤں میں یقین کرنے والے تھے جب کہ ہندو اور مسلمان وحدانیت کے قائل تھے، اسی لیے ہندوستان میں ہندو، مسلمان، آتش پرست اور یہودی ان کے مذہب کو سچا مذہب نہیں تسلیم کر سکتے تھے۔ ۱۱، مجاہدین آزادی پہلی جنگ آزادی کے دوران اسی موقف پر قائم رہتے ہوئے انگریزی حکومت سے جنگ آزما ہے۔

۱۸۵۷ء کے اعلانیوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ باغی فوجیوں کو عوام کی حمایت حاصل تھی، وہ انگریزوں کے جابرانہ رویہ کے نہ صرف شاکی تھے بلکہ ان کو یقین تھا کہ انگریزوں کی حکومت میں ہندوستانیوں کی جان، مال اور آبرو محفوظ نہیں تھی، وہ انگریزوں کے فریب اور شاطرانہ

چالوں کو خوب سمجھ رہے تھے، کیوں کہ وہ ہندو اور مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتے تھے، حد سے زیادہ مال گزاری عاید کر کے، اس کی جبراً وصولی اور عدم وصولی کے بدلہ میں زمین داریوں کے نیلام نے بہت سے زمین داروں اور ان سے منسلک رعیت کو تباہ کر دیا تھا، انگریزوں نے اعلا اور قیمتی اشیا کی برآمد و درآمد پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی، ہندوستانیوں کو اعلا ملازمتوں سے محروم کر رکھا تھا، ہندوستانی فوجیوں کی تنخواہیں انگریز اور یورپین ملازمین فوج کے مقابلہ میں بہت کم تھیں، انگریزی حکومت کی درآمد اور برآمد کی حکمت عملی کی وجہ سے ہندوستانی دستکار، کاریگر غربت اور فاقہ کشی کا شکار تھے، پنڈتوں اور علما کا بھی حال برا تھا!! (الف)، اعلانیوں کے ذریعہ مجاہدین آزادی نے عوام کو یقین دلایا تھا کہ ہندوستانیوں کی عمل داری قائم ہونے کے بعد سب کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہوگی، جیسے پہلے تھی اور ہر آدمی اپنے دین دھرم پر قائم رہے گا، عزت و آبرو ہر شخص کی قائم رہے گی اور کسی بے گناہ کو قتل نہیں کیا جائے گا، کسی کا مال زور زبردستی سے نہیں حاصل کیا جائے گا اور عورتوں کی عزت و ناموس کی حفاظت ہوگی، شہزادہ فیروز شاہ نے اپنے اعلانیہ میں یہ بھی یقین دلایا تھا کہ بادشاہی عمل داری کے قیام کے بعد ملک کے ہر طبقہ کو تجارت اور ملازمت میں سہولت حاصل ہوگی اور زمین داروں کو بھی انگریزوں کے جابرانہ نظام سے راحت ملے گی۔ ۱۲

۱۸۵۷-۵۸ء کے اردو اعلانیوں کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ان کی زبان سادہ اور عام فہم ہے، مثلاً خان بہادر خاں کا اعلانیہ عربی کی مہر ''الحکم للّٰہ والملک للّٰہ'' سے شروع ہوتا ہے، مہر کے ٹھیک نیچے ''دھرم کی فتح کا خط'' تحریر ہے، یہ ایک طویل اعلانیہ ہے جو روہیل کھنڈ کے راجاؤں کے نام ہے، اعلانیہ سے چند ابتدائی جملے پیش کیے جا رہے ہیں، تاکہ اندازہ کیا جا سکے کہ مجاہدین آزادی کی آرا کیا تھیں، وہ کس نہج پر سوچ رہے تھے اور وہ کیا چاہتے تھے:

> ''آپ سب راجا لوگ بڑے دھرم اور خوبیوں والے ہو اور سخی داتا، برداشت کرنے والے بہادر اور سنبھالنے والے اپنے دھرم اور اوروں کے دھرم کے ہو...... اور خدا تعالیٰ نے اپنا اپنا دھرم کرنے کے لیے یہ سریر تم کو دیا ہے...... اور اپنے دھرم کو خراب کرنے والوں کو مارنے کے واسطے خالق نے تم راجہ لوگوں کو پیدا کیا ہے''۔ ۱۳

برجیس قدر کے اعلانیہ مورخہ ۲۵؍ جون ۱۸۵۸ء میں مجاہدین آزادی کے جذبات سیدھے سادے الفاظ میں ظاہر کیے گئے ہیں:

> ''سب ہندو اور مسلمان یہ جانتے ہیں کہ چار چیزیں ہر ایک مانس کو بہت پیاری ہیں، اول دین و دھرم، دوسرے عزت و آبرو، تیسرے جان اپنی اور اپنوں کی، چوتھے مال و اسباب''۔ ۱۴

لیکن بعض اعلانیے جیسے مولوی لیاقت علی کا الہ آباد اعلانیہ فارسی آمیز اردو اور قرآنی آیات کے اقتباسات سے خاص طور سے مسلمانوں کو جہاد کے لیے آمادہ کرنے کی نیت سے لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے، اس اعلانیہ کی ابتدا حمد باری تعالیٰ، درود و سلام نبی ﷺ، صحابہ کرام اور تابعین سے ہوتی ہے، اس اعلانیہ میں قرآن پاک کے حوالہ سے ''کفرہ و فجرہ نصاریٰ'' کے خلاف عوام کو بالخصوص مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی گئی ہے، کیوں کہ برجیس قدر، تمام راجگان قلم رو لکھنؤ و راج گان قرب و جوار الہ آباد بالاتفاق اندفاع قوم نصاریٰ طاغی باغی کے ہو چکے تھے۔

ایک اور اہم اعلانیہ رسالہ فتح اسلام ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ایک بیش قیمت دستاویز ہے، اس رسالہ کو جاری کرنے والے کا نام نہیں ملتا، تاہم رسالہ کے متن اور دیگر تفصیلات سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اسے مولوی احمد اللہ شاہ نے جو فیض آباد کے مولوی کے نام سے بھی معروف ہیں جاری کیا تھا، اس طویل رسالہ میں انگریزوں کے مظالم کی خوں چکاں داستان کے بعد عوام کو جہاد میں شریک ہونے کی پرزور اپیل کی گئی ہے، اس میں رسالہ کی زبان عام فہم اور عربی و فارسی کے الفاظ کی آمیزش کم ہے، رسالہ میں مجاہدین آزادی کو آداب جنگ بتلائے گئے ہیں جیسے ان کو کوچ اور مقام کے درمیان لوٹ مار سے گریز کرنے، جہاں فتح حاصل ہو وہاں کی رعیت کی حفاظت کرنے اور لوٹ مار کرنے والوں کو سخت سزا دینے کا حکم دیا گیا ہے، اس رسالہ میں قیادت کے مسئلہ پر بھی ہدایت دی گئی ہے جو دلچسپ ہے، اس میں واضح کیا گیا ہے کہ انگریزوں کی تابع داری نہیں کرنی چاہیے، یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں قیادت کے مختلف مرحلوں کا ذکر کیا گیا ہے:

> ''عقل اور دین کی شرم بھی یہی کہتی ہے کہ بکٹوریہ کافرہ اور دین کی دشمن، انگریزوں کی تابع داری سے مسلمان امیر کی تابع داری اور بادشاہ کے تابع دار

راجہ کی تابع داری کروڑوں درجہ افضل ہے...... اور سب ہندو دل وجان سے
مطیع الاسلام اور بادشاہ کے خیر خواہ تھے تو اب بھی وہی ہندو اور وہی مسلمان ہیں
اور وہی کتاب ہے، اپنے دین پر وے رہیں اور اپنے دین پر ہم رہیں گے، ہم
ان کی محافظت کریں گے، وے ہماری مدد اور محافظت کریں گے، نصاریٰ مردود
نے ہندو اور مسلمان دونوں کو کرشتان کرنا چاہا تھا، اللہ نے خیر کیا الٹے وے آپ
ہی خراب ہوگئے"۔ ۱۵

اس رسالہ کے آخر میں انگریزوں سے کسی قسم کا ربط وضبط نہ قائم رکھنے پر زور دیا گیا ہے
اور اپیل کی گئی ہے:

"سارے ہندو اور مسلمان ان کی کسی قسم کی نوکری نہ کریں اور ان کی نوکری
میں پنڈت اور مولوی کے قتل کی شراکت سمجھیں"۔ ۱۶

۱۸۵۷ء میں اور کسی مقام کی بہ نسبت دہلی سے بہت سے فرامین، اعلانیے اور حکم نامے
جاری ہوئے تھے جو زیادہ تر اردو میں اور چند فارسی میں ہیں، یہ دستاویزات نیشنل آرکائیوز نئی
دہلی میں محفوظ ہیں، میرے خیال میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی یہ دستاویزیں شاہی دفتر خانہ
سے تمام وکمال انگریزوں کے ہاتھ لگ گئی تھیں، اسی لیے اور مقامات کے مقابلہ میں یہ زیادہ مکمل
اور تسلسل کے ساتھ موجود ہیں جن سے دہلی کی ۱۸۵۷ء کی مکمل تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے، یہ
دعویٰ کرنا مناسب نہ ہوگا کہ اس سے پہلے کسی ہندوستانی محقق نے ان دستاویزات کو نہیں دیکھا،
کیوں کہ پروفیسر مہدی حسن اور سید اطہر عباس رضوی نے ان دستاویزات کا خاصہ استعمال اپنی
کتابوں میں کیا ہے ۱۷، بہر حال اس مضمون میں ضمناً چند اعلانیوں اور فرامین کے حوالے پیش
کیے جارہے ہیں، ۱۸۵۷ء میں دہلی پر مجاہدین آزادی کے غلبہ کے بعد، نئی آزاد حکومت گوناگوں
مسائل سے دوچار ہوئی تھی، امن وامان برہم ہو چکا تھا، دہلی اور قرب وجوار کے تھانوں سے
روزمرہ کے احوال کی رپورٹ آنی بند ہو چکی تھی، بہادر شاہ نے اپنے حکم نامہ مورخہ ۱۹ رمئی
۱۸۵۷ء کے ذریعہ تمام تھانہ داروں کو معمول کے مطابق رپورٹ بھیجنے کی تاکید اور یہ سخت ہدایت
دی تھی کہ وہ اپنے اپنے تھانوں پر موجود رہیں اور شہر میں امن وامان بحال کریں، شہر میں پابندی

سے گشت لگائیں اور شہر میں ہونے والے واقعات کی مکمل رپورٹ کوتوال کو بھیجتے رہیں، حکم کی
خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف سخت سزا کی تجویز کی گئی تھی۔ ۱۸

بہادر شاہ کی تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود دہلی کے عوام، بالخصوص تاجر لوٹ مار کی
وارداتوں سے پریشان تھے، ۱۳ رمئی کو بہادر شاہ نے چاندنی چوک کا دورہ کر کے لوگوں کی ہمت
بڑھائی تھی جس کی وجہ سے دوکانیں کھلنی شروع ہوئی تھیں لیکن دوکان داروں نے جلد ہی دوکانیں
بند کردیں، ۱۱ رجون ۱۸۵۷ء کے فرمان میں بہادر شاہ نے کوتوال شہر کو ہدایت دی کہ وہ اعلان
کریں، تاکہ دوکان دار اپنی دوکانیں بے خطر کھول سکیں، یہ بھی ہدایت دی تھی کہ دوکان داروں
کے تحفظ کا پورا انتظام کیا جائے، برقندازوں اور چوکی داروں کے ذریعہ دن رات عوام کی خبر گیری
کی جائے، مگر بہادر شاہ کی توجہ اور حکم کے باوجود شہر کے حالات میں کوئی بہتری نہیں ہوئی، خوف زدہ
دکان داروں نے بہادر شاہ سے صورت حال کی ابتری کی شکایت کی، بے بس بادشاہ نے جن کے
پاس نام کے سوا کچھ نہ تھا، ۹ راگست ۱۸۵۷ء کو فوج کے تینوں شعبوں کے افسران کے نام جاری
کردہ حکم نامہ میں اپنے غم اور افسوس کے ساتھ لکھا تھا کہ اگر یہی صورت حال جاری رہی تو شہر کیسے
خوش حال رہ سکے گا، عوام بھی تکلیف اٹھائیں گے۔ ۱۹

ہر چند کہ مجاہدین آزادی نے انگریزوں کو دہلی سے خارج کردیا تھا لیکن وہ دہلی سے
دور بھی نہیں تھے اور ریشہ دوانیوں میں مصروف تھے، ان کو امید تھی کہ آنے والی بقرعید کے موقع پر
وہ دہلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان گاؤکشی کے مسئلہ پر پھوٹ ڈالنے اور امن امان
درہم برہم کرانے میں کامیاب ہوجائیں گے، بہادر شاہ نے حالات کی نزاکت کے پیش نظر اپنے
معتمد جنرل بخت خاں کو حکم دیا تھا کہ گاؤکشی پر پابندی کا حکم جاری کریں، بخت خاں نے ۲۸ ر
جولائی سے ۳۱ رجولائی ۱۸۵۷ء کے درمیان کئی حکم نامے اور اعلانیے جاری کیے تھے جس میں
گاؤکشی، گائے کی خرید وفروخت اور اس کے گوشت کی دہلی میں درآمد پر مکمل پابندی کے احکام
تھے، حکم کی خلاف ورزی کرنے والوں کو موت کی سزا تجویز کی گئی تھی، سخت احتیاط اور نگرانی کی
وجہ سے بقرعید کا تیوہار بخیر وخوبی گزر گیا ۲۰، تاہم انگریزوں کا خطرہ بدستور قائم رہا، انہوں نے
دہلی کے قریب پہاڑی پر قبضہ کر کے اپنی فوجی چوکیاں قائم کرلی تھیں، انگریزوں کی برتر فوجی

پوزیشن نے بہادر شاہ کو بے چین کر دیا تھا، انہوں نے پہاڑی پر قبضہ حاصل کرنے کے لیے کئی حکم نامے جاری کیے تھے، ۱۰ر ستمبر ۱۸۵۷ء کے حکم نامہ میں انہوں نے جو لکھا تھا وہ بادشاہ کی ذہنی حالت بتلاتا ہے:

"ہندو کو گائے اور مسلمان کو سور کا لحاظ کر کے اور دین و دھرم کو سمجھ کر بس کہ، میری زندگی تم کو عزیز ہو تو دیکھتے ہی اس حکم نامہ کے پلاٹن و رسالہ و توپ خانہ سب تیار کر کے اوپر کشمیری دروازہ کے حاضر ہو کر مخالفان نا ہنجار و کفاران بد افعال پر دھاوا کرو، اس باب میں ایک لحظہ تامل اور تغافل نہ کرو...... تم اس تخت کی شرم رکھو اور جو دین اور ایمان پر آئے ہو تو اس کا لحاظ کرو"۔ [۲۱]

۱۸۵۷-۵۸ء میں جاری کردہ اردو علانیوں کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ ان میں بے تکلفانہ ہندی الفاظ استعمال کیے گئے ہیں، جیسے سریر، ریت، رانڈ، دھرم ستی، راج دہن، پوتر، دیش، مانس، ماس، لکا چھپا، دھاوا، ایکا، داتا وغیرہ، اس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی تک اردو اور ہندی کا کوئی قضیہ نہیں تھا لیکن ۱۸۵۷ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے ایک دوسرے کے مذہب کے متعلق عقیدت اور تحفظ کا اظہار کیا تھا اور وہ انگریزوں کے عیسائی بنانے کی مہم کے خلاف متحد ہو گئے اور دنیا کی سب سے بڑی طاقت کو اپنی بے مثال یک جہتی اور اتحاد سے مغلوب کر دیا تھا، انگریزوں کے لیے ہندو مسلم اتحاد ان کے مفاد کے لیے سخت خطرہ تھا، اس لیے وہ اسے ہر صورت سے توڑ دینا چاہتے تھے، ان کے خفیہ مراسلات اس امر کے شاہد ہیں، مثلاً ۱۰ر مئی ۱۸۵۸ء کو لارڈ الفنسٹن نے گورنر بمبئی کو لکھا تھا:

"پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" قدیم رومن مقولہ کو اپنا لینا چاہیے، میں شاید اپنے اس پختہ خیال کے اظہار میں پس و پیش کرتا، اگر میں نے اپنے نظریہ اور ڈیوک آف ولنگٹن کے نظریہ میں مماثلت نہ پائی ہوتی"۔ [۲۲]

وقت کے ساتھ ساتھ یہ نظریہ زور پکڑتا گیا، چنانچہ ۱۰ر مئی ۱۸۶۲ء کو چارلس ووڈ نے وائسرائے الگن کو لکھا تھا:

"ہم نے اپنے اقتدار کو ایک دوسرے سے لڑا کر قائم کیا ہے اور ہمیں

ایسا ہی کرتے رہنا چاہیے، لہذا سب کے جذبات کو ہم آہنگ ہونے سے روکنے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہو، کرو"۔ [۲۳]

اس سے پہلے چارلس ووڈ نے ۱۹ر مئی ۱۸۶۲ء کو لکھا تھا:

"ہم ہندوستان میں اپنے اقتدار کی بقا کے لیے کسی بھی طریقہ کو نظر انداز نہیں کر سکتے، قوموں کی فطری دشمنی ہماری طاقت کا معمولی جز نہیں ہے، اس پر انحصار کرو، اگر سارا ہندوستان ہمارے خلاف متحد ہو گیا تو ہم کتنے عرصہ تک خود کو سنبھال سکیں گے"۔ [۲۴]

ان اقتباسات کی روشنی میں ۱۸۵۸ء کے بعد برطانوی حکمت عملی کے تحت ہندوستانیوں پر کیا گزری، ہندوستان کی سیاست نے کتنی کروٹیں لیں اور کس کس طرح کی تحریکات پیدا ہوئیں، تقسیم بنگال (۱۹۰۵ء) سے تقسیم ہندوستان تک کیا کیا گزرا، اچھی طرح سمجھا جاسکتا ہے، آج ہم ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی کی ڈیڑھ سو سالہ تقریب منا رہے ہیں، اگر ہم صرف ۱۸۵۷ء کے مجاہدین آزادی کے اغراض و مقاصد ہندوستان کے دونوں بڑے مذاہب ہندو دھرم اور اسلام کے متعلق ان کے نظریات کو سمجھ کر ملک میں عام کر دیں تو ملک سے روز افزوں فرقہ وارانہ ناسور کو ختم کرنے میں کامیاب ہو کر شہیدان ۱۸۵۷ء کو صحیح خراج عقیدت پیش کر سکتے ہیں۔

حواشی

۱ I.G.A. Griersow, Linguistic Survey of India, Vol.IX, Pt.I, Delhi, 1990, (second reprint) p.45.

۲ سرسید کے مطابق "اہل حرفہ کا روزگار بہ سبب جاری اور رائج ہونے، اشیائے تجارت ولایت بالکل جاتا رہا تھا، یہاں تک کہ ہندوستان میں کوئی سوئی بنانے والے اور دیا سلائی بنانے والوں کو بھی نہیں پوچھتا تھا، جولاہوں کا تار تو بالکل ٹوٹ گیا تھا"، اسباب بغاوت ہند، آگرہ ۱۸۹۶ء، ص ۳۶۔

۳ سلطان الاخبار، ۱۰ر جون ۱۸۵۷ء، چارلس بال، دی ہسٹری آف انڈین میوٹنی، ج ۱، ص ۶۰-۴۵۹۔

۴ ایضاً۔

۵ The Indian Church during the Great Rebellion, cited in Rizvi, Freedom

Struggle .... Vol-I, Lucknow, 1957, p.287.

۶ Nana; Proclamation, 8 November 1857, foreign Political Consultations, 22 october,1858, No;18, National Archives, New Delhi.

۷ ظفر نامہ وقائع غدر، انڈیا آفس لندن، نمبر ۱۴۳۱، ص ۲۳۔

۸ ایضاً۔

۹ Durgadas Bandopodhyay, Vidrohi Bengali, Calcutta, 1985, pp 343-44. (بنگالی سے ترجمہ کے لیے پروفیسر گوتم بھدرا کا مشکور ہوں)

۱۰ Rajat K Ray, Indian Colonial Encounter, Delhi 1993.

۱۱ Foreign Political Consultations, 13 May 1859. No;326, NAI, New Delhi, Rizvi, Freedom Struggle .... Vol-II, pp.603-4.

۱۲ برجیس قدر کا اعلانیہ، بحوالہ رضوی، فریڈم اسٹرگل ......ج ۱، ص ۶۸ - ۶۵۴۔

۱۳ اعلانیہ برجیس قدر فارن ڈپارٹمنٹ (سیکرٹ) نمبر ۶۹ - ۶۸، ۲۵ / جون ۱۸۵۸ء، نیشنل آرکائیوز نئی دہلی۔

۱۴ اعلانیہ فیروز شاہ، ۲۵ / اگست ۱۸۵۸ء، بحوالہ چارلس بال ہسٹری آف انڈین میوٹنی، ج ۲، ص ۳۲-۳۰۔

۱۵ Press list of Mutiny Papers, 1857, No. 194, SN 38 . NAI, New Delhi.

۱۶ Foreign Depratment (Secret), 25 june 1858, No. 68-69, NAI, New Delhi.

۱۷ رسالہ فتح اسلام، مملوکہ سید حامد علی صاحب گورکھ پور، اس کی زیراکس کاپی پروفیسر محمود الٰہی صاحب، سابق صدر شعبہ اردو گورکھ پور یونی ورسٹی نے ناچیز کو عنایت کی تھی جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔

۱۸ رسالہ فتح اسلام۔ ۱۷ ملاحظہ ہو ڈارلمپل، دی لاسٹ مغل، بہادر شاہ دوم اور سوتنتر دلی، علی الترتیب۔

۱۹ Press list .... No. 120/1, 19 may 1857, NAI, New Delhi.

۲۰ Press list .... No. 120/43 and III (c) / 64 dated 29 and 30 july 1857, NAI, New Delhi.

۲۱ Press list .... No. 461, 10 september 1857, NAI, New Delhi.

۲۲ بی-ان-پانڈے، اے سینٹری آف انڈین نیشنل کانگریس، ج ۱، ص ۶۷ - ۲۶۲۔

۲۳ ایضاً۔

۲۴ ایضاً ص ۶۷ - ۲۶۳۔

علامہ شبلی نعمانیؒ - شخصیت، افکار اور کچھ نئی باتیں

پروفیسر ظفر احمد صدیقی*

اس مقالے کا آغاز مولانا سید سلیمان ندوی کے ایک اقتباس سے کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، جس میں انہوں نے اپنے محبوب استاد کے فضائل و کمالات کا عطر کشید کر کے رکھ دیا ہے، لکھتے ہیں:

" تماشا گاہ عالم میں کمال کا جو جوہر انہوں نے دکھایا، یقین ہے کہ دنیا زمانے تک اس کی مثال پیش نہیں کر سکے گی:

شبلی ز خیل زمزمہ سنجاں حشم گرفت
با ایں کہ ہیچ گونہ ز خیل و حشم نداشت

مولانا کے حریف تلوار کا صرف ایک ہی وار جانتے تھے، یا فقیہ و محدث تھے یا فقط انشاپرداز، یا زباں آور خطیب، یا سخن فہم و سخن سنج لیکن یہ یگانۂ روزگار مجموعہ ہر علم و فن تھا جس رستے پر قدم رکھا میدان میں سب سے آگے نظر آیا، علوم دینی و مشرقی میں جو تبحر ان کو نصیب تھا، اس سے یہ جدید ارکان خالی تھے اور قدیم علما جدید مسائل سے بے خبر تھے، تاریخ کا وہ اس بازار میں تنہا جوہری تھا، فلسفہ و کلام کا وہ امام تھا، شاعری کا وہ کہنہ مشق استاد تھا، انشاپردازی کے پامال کوچے میں بھی اس کی راہ الگ تھی، انشاپردازی و زباں آوری ان دونوں کشوروں میں یکساں صرف اسی کا سکہ رواں تھا، سخن سنجی اس کے طائر کمال کے شہپر تھے۔

---

* پروفیسر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

اس میں دوسری جامعیت یہ تھی کہ وہ صرف دماغ نہ تھا، ہاتھ بھی تھا، قومی تحریکوں کے عواقب پر جہاں اس کی نظر پہنچی، حریف اس کے دیکھنے سے قاصر تھے، اس کا دماغ جن دینی کاموں کا تماشا دیکھتا تھا اور دکھانا چاہتا تھا، بہت سی آنکھیں اس کے دیکھنے کی صلاحیت بھی نہیں رکھتی تھیں، قومی، تعلیمی، اجتماعی، سیاسی، ادبی، مذہبی غرض عمل کا کوئی گوشہ نہ تھا جس کی طرف اس کا ہاتھ نہ بڑھا"۔ (یادرفتگاں، ص ۱۹/شبلی معاصرین کی نظر میں، ص ۱۱۰)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا شبلی کی شخصیت اپنے معاصرین میں سب سے زیادہ پرکشش اور دل آویز ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ وہ یک رخے اور یک فنے نہیں ہیں بلکہ پہلودار اور ہمہ جہت ہیں، چنانچہ وہ ادیب و انشاپرداز بھی ہیں اور شاعر و ناقد بھی، متکلم و معقولی بھی ہیں اور مورخ و سوانح نگار بھی، شاہان عجم کے مدح خواں بھی ہیں اور عظیم المرتبت سیرت نگار بھی، صاحب تصانیف و کتب بھی ہیں اور بلند پایہ مقالہ نگار بھی۔

پھر ان کے کارناموں کا الگ الگ جائزہ لیجیے تو ہر جگہ ایک سے زیادہ ہی پہلو نظر آئیں گے، مثلاً ان کی انشاپردازی نہ حالی کی طرح سادہ، سپاٹ اور خشک ہے نہ محمد حسین آزاد کی طرح مرصع، رنگین اور پر از تشبیہات و استعارات بلکہ دونوں کی ملی جلی کیفیت لیے ہوئے ہے، اسی طرح بہ حیثیت شاعر وہ نظم گو بھی ہیں اور غزل گو بھی، انہوں نے قصیدے بھی لکھے ہیں اور مثنویاں بھی، رباعیاں کہی ہیں اور مرثیے بھی، پھر سنجیدہ شاعری بھی کی ہے اور طنزیہ بھی، فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور اردو میں بھی۔

زندگی اور اس کے حقائق و مسائل کے بارے میں بھی وہ محض ایک رخ یا ایک زاویے پر سوچنے کے عادی نہ تھے، بلکہ وہ مسئلے کے ہر پہلو کو سامنے رکھتے تھے، مثلاً ان کا خیال تھا کہ کوئی قوم محض ماضی پر تکیہ کر کے اور قدامت پسندی کے دائروں میں محصور ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی، ساتھ ہی وہ اس بات کے قائل تھے کہ محض تجدد پسندی پر انحصار اور اپنی روایات سے یکسر انقطاع بھی باخبر اور بیدار مغز قوموں کا شیوہ و شعار نہیں، اسی لیے وہ اپنی تحریر و تقریر میں ہر جگہ جدت و قدامت، روایت و بغاوت اور ماضی و حال کو آمیز کرنے کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔

تعلیم کے بارے میں ان کا نظریہ علمائے قدیم و دانش وران جدید دونوں سے مختلف تھا، ان کا خیال تھا کہ علوم قدیمہ زمانے کی ضروریات کا ساتھ نہیں دے سکتے اور محض علوم جدیدہ، دین و مذہب سے بے گانہ بناتے ہیں، وہ عربی مدارس کے نصاب میں تجدید و اصلاح کو ضروری سمجھتے تھے، علما کے لیے انگریزی زبان کی تعلیم کو لازمی اور ہندی و سنسکرت سے واقفیت کو مفید تصور کرتے تھے، اسی طرح مذہبی و اخلاقی تعلیمات کے بغیر علوم جدیدہ کے نصاب کو غیر مفید اور ناکمل قرار دیتے تھے۔

عورتوں کے بارے میں ان کے خیالات دل چسپ اور فکر انگیز ہیں، ان کا خیال تھا کہ عورتوں کو گھر کی چہار دیواری میں محدود و مقید کر دینا یا جاہل محض بنائے رکھنا نامناسب ہے، وہ چاہتے تھے کہ مردوں کی طرح وہ بھی حالات زمانہ سے باخبر، تعلیم یافتہ، مہذب و شائستہ اور تحریر و تقریر کی صلاحیتوں سے بہرہ ور ہوں بلکہ آگے بڑھ کر وہ یہاں تک کہتے تھے کہ عورتوں کا ہمہ وقت چھوئی موئی اور دھان پان بنا رہنا ہی، مردوں کے ہاتھوں ان پر ظلم و ستم ڈھائے جانے کا سبب بنا رہا ہے، لہذا انہیں شیوۂ آرائش جمال کو ترک کرنا اور فلسفۂ حرکت و عمل پر عامل ہونا چاہیے، البتہ وہ پردے کے قائل تھے اور مرد و زن کے آزادانہ اختلاط کو سخت ناپسند کرتے تھے۔

انڈین نیشنل کانگریس ۱۸۸۵ء میں مولانا شبلی کے سامنے ہی قائم ہوئی تھی، بعض اسباب و وجوہ کی بنا پر سرسید اور بعض دوسرے سربرآوردہ حضرات اس کے ہم نوا نہ تھے اور مسلمانوں کو خاص طور پر اس سے دور رہنے کا مشورہ دیتے تھے، مولانا شبلی کو سرسید کی اس رائے سے اتفاق نہ تھا، وہ اس تحریک سے مسلمانوں کی وابستگی کو نہ صرف مفید بلکہ ضروری خیال کرتے تھے، ابوالکلام آزاد کی سیاسی تربیت مولانا شبلی ہی کے زیر سایہ ہوئی تھی، کانگریس کے برخلاف مسلم لیگ کی حیثیت ان کی نگاہوں میں مشکوک و مشتبہ تھی، ان کا خیال تھا کہ یہ تحریک انگریزوں کی خوشامد، چاپلوسی اور موقع پرستی کے لیے وجود میں آئی ہے، اس پر انہیں یہ اعتراض بھی تھا کہ اس کے کارکنوں میں مقصدیت، جفاکشی، سخت کوشی اور ایثار و قربانی کی روح مفقود ہے۔

مولانا شبلی کی تحریروں کا پس منظر اور ماحول اگرچہ عمومی احوال کے لحاظ سے اسلامی ہے لیکن ان کا ذہن و مزاج تعصب سے خالی اور روادارانہ تھا، اس سلسلے میں ان کے مضمون

''مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ'' کی چوتھی قسط خاص طور پر قابل مطالعہ ہے، اس کے علاوہ اپنے تاریخی مقالات میں بھی انہوں نے جہاں شاہانِ تیمور کی عدل گستری و خلق پروری کی داستانیں سنائی ہیں، وہیں ہندو راجگان و مہاراجگان کی تعریف و توصیف بالخصوص ان کی وفا کیشی کے بیان میں رطب اللسان بھی رہے ہیں۔

مولانا شبلی کی شخصیت کا یہ پہلو بھی لائق ذکر ہے کہ ان میں فیض رسانی و مردم سازی کی صلاحیت بہ درجہ کمال موجود تھی، چنانچہ ان کی صحبت کا فیض اٹھا کر صاحب قلم بننے والوں کی فہرست طویل بھی ہے اور قابل رشک بھی، چند نام بہ طور مثال ملاحظہ ہوں:

خواجہ غلام الثقلین، مولوی عبدالحق، حسرت موہانی، سجاد حیدر یلدرم، ظفر علی خاں یہ سب علی گڑھ کے زمانہ قیام کے شاگرد اور مستفیدین ہیں، ندوی فیض یافتگان میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، ضیاء الحسن علوی اور مولانا عبدالباری ندوی خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ مولانا کے خرمن علم و ادب کے خوشہ چینوں میں عبداللہ عمادی، ابوالکلام آزاد اور عبدالماجد دریابادی کے نام بھی شامل ہیں۔

مولانا شبلی کا ایک امتیازی پہلو یہ بھی ہے کہ وہ تصنیف و تالیف کی بے پناہ صلاحیتوں سے بہرہ ور ہونے کے ساتھ ساتھ علمی خطوط پر سوچنے، کام کرانے اور منصوبے تیار کرنے میں بھی ماہر تھے، ان کا ذہن علم و ادب کی نوع بہ نوع شکلیں تلاش کرتا رہتا تھا، چنانچہ انجمن ترقی اردو کی سکریٹری شپ، ندوۃ العلما کی معتمدی، ماہ نامہ الندوہ کی ادارت، علمی نمائشوں کے اہتمام اور اہم مخطوطات کی اشاعت سے متعلق ایک ادارے، نیز دارالمصنفین کے قیام کی تجویز کو اس سلسلے کی مثالوں میں پیش کیا جاسکتا ہے۔

مولانا شبلی کی شخصیت اور کردار کے امتیازی پہلوؤں کے ذکر کے بعد اب ہم مولانا سے متعلق بعض نادر اور نئی معلومات پیش کرنا چاہتے ہیں، یہ معلومات نادر اور نئی اس لیے ہیں کہ حیات شبلی، سیرت شبلی، یادگار شبلی اور مولانا سے متعلق کسی بنیادی یا ثانوی ماخذ میں ان کا ذکر موجود نہیں ہے۔

۱- مولانا کے شغف علمی اور ذوق مطالعہ کا ذکر ان کے احباب و معاصرین نے عام طور پر کیا ہے، اسی سلسلے کی ایک بات یہ بھی ہے کہ دوسرے اہل قلم اور مصنفین کے ساتھ علمی تعاون میں

مولانا ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے، حکیم بدرالدین دہلوی (ولادت ۱۸۴۰ء) تلمیذ حکیم احسن اللہ خاں دہلوی نے ''امتحان الألباء لكافة الأطباء'' کے اردو ترجمے موسوم بہ ''بدرالدجیٰ'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ طب کے موضوع پر متذکرہ بالا عربی کتاب کے مصنف عبدالعزیز بن علی مطبب ہیں، یہ ۶۸۸ ہجری سے قبل کی تصنیف ہے، انہیں اس کتاب کا قلمی نسخہ اپنے استاد حکیم احسن اللہ خاں سے ملا تھا جس پر اکبر، شاہ جہاں اور دیگر سلاطین مغلیہ کی مہریں تھیں، ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے دوران یہ نسخہ شاہی کتب خانے سے باہر آیا اور اس کے آخر کے چند صفحات ضائع ہوگئے، اس کتاب کی اہمیت و افادیت کے پیش نظر حکیم بدرالدین دہلوی نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا لیکن ناقص الآخر ہونے کی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ اس کا کوئی دوسرا قلمی نسخہ مل جائے تو تکمیل کے بعد اسے شائع کریں لیکن ملکی و غیر ملکی اخبارات میں اشتہارات، اہل علم و فضل سے رجوع اور اہل شوق احباب کی مسلسل تلاش و جستجو کے باوجود کہیں سے اس کتاب کے کسی دوسرے نسخے کا سراغ نہ مل سکا، اس کے بعد کی داستان خود حکیم صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ ہو، لکھتے ہیں:

''اتفاقاً جناب شمس العلما مولوی محمد شبلی صاحب نعمانی .... کسی تقریب میں دہلی آئے، میں نے ان سے کتاب مذکور کا تذکرہ کیا، مولوی صاحب موصوف نے باوجود وسعت نظر اور غیر محدود واقفیت کے کتاب سے اپنی عدم واقفیت ظاہر فرمائی، ہاں اس کے ساتھ وعدہ فرمایا کہ اگر کہیں نگاہ پڑی تو ضرور اطلاع دوں گا، اس کے چند دن بعد مولوی صاحب کو سفر بیروت و مصر و قسطنطنیہ درپیش ہوا اور وہاں ان کے علم و فضل نے کتابوں کی سیر کرائی، اس کتاب کا ایک نسخہ قلمی خدیو کے کتب خانے (مصر) میں انہوں نے دیکھا اور اپنی یادداشت کے لیے کتب خانے کے کمرے اور الماری کتاب کے نمبر پاکٹ بک میں نوٹ کرلیے ...... جب وہ مع الخیر ہندوستان واپس آئے تو یہ نوید مجھے سنائی اور نمبر مجھے بھیج دیے، میں نے ان نمبروں کے ذریعے مہتمم کتب خانہ خدیویہ سے تحریرات کا سلسلہ جاری کیا...... غرض میری یہ سعی بھی مشکور نہ ہوئی، میں نے مکرر شمس العلما موصوف کو تکلیف دی، انہوں نے اپنی علم دوستی و اخلاق عمیم سے مزید تکلیف

گوارا کر کے اپنے توسط سے میری کتاب مصر بھجوادی اور مسمیٰ جارج زیدان کسی اپنے دوست فاضل یوروپین کی معرفت کتب خانہ خدیویہ کے نسخے سے اس کے گم شدہ اوراق کو بہ احتیاط نقل و مقابلہ معرفت احمد بن ابراہیم کرا کے مجھے چند روز میں واپس منگادی، متذکرہ بالا کتاب دہلی سے مئی ۱۹۰۰ء میں شائع ہوئی"۔

(امتحان الالباء لکافۃ الاطباء، ص ۶-۳)

۲- مولانا سید عبدالحی حسنی (ف ۱۹۲۳ء) کی معرکہ آرا تصنیف "نزهة الخواطر وبهجة المسامع والنواظر" ہندو بیرون ہند یعنی ممالک عربیہ میں بھی مشہور و متداول ہے لیکن یہ بات بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ علمائے ہند کے طبقات و تراجم کے موضوع پر اس کتاب کی تالیف کا مشورہ انہیں مولانا شبلی نے دیا تھا، اس ضمن میں خود صاحب نزہۃ الخواطر کا بیان ملاحظہ ہو، رقم طراز ہیں:

"آج سے بیس برس پہلے میں نے عربی میں ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا، جس میں ہندوستان کے عربی شاعروں کے حالات اور ان کے عربی اشعار اس طور پر درج کیے تھے جیسے کہ علامہ آزاد نے سرو آزاد و ید بیضا وغیرہ تذکروں میں فارسی شعرا کے حالات یکجا کیے ہیں، مولانا شبلی کو اس کا علم ہوا تو انہوں نے مجھ سے کہا کہ علمائے ہندوستان کے حالات میں اب تک کوئی مستقل کتاب نہیں لکھی گئی، لہذا اس موضوع کو زیادہ وسیع کر دینا چاہیے، مجھ کو یہ مشورہ مولانا ممدوح کا پسند آیا، مگر دیکھا تو حالات ملنے کا کوئی ذریعہ نہیں، کسی کے حالات اس وقت مل سکتے ہیں، جب اس کے معاصرین نے قلم بند کیے ہوں اور اگر انہوں نے اس میں کوتاہی کی ہو تو پھر کوئی ذریعہ باقی نہیں رہتا، خیالی مضمون ہو تو اس کو جس طرح چاہے آدمی گھٹا بڑھا سکتا ہے، تاہم میں نے کوشش شروع کی، جہاں گیا وہاں کے کتب خانے دیکھے، تاریخ کی صدہا کتابیں پڑھیں، بزرگوں کے ملفوظات، شعرا کے تذکرے، عربی اور فارسی کی ہزارہا کتابیں دیکھیں اور جہاں سے جو کچھ ملا، اس کو لیا، ان تمام کوششوں کے بعد یہ کتاب ختم ہوئی جس کا نام "نزهة الخواطر

و بهجة المسامع والنواظر" ہے"۔ (ماہ نامہ الندوہ، لکھنؤ، اپریل ۱۹۱۵/ افکار و شخصیات، ص ۱۱۳)

۳- مولوی احسن اللہ خاں ثاقب، امیر مینائی کے شاگرد اور وکٹوریا کالج گوالیار میں پروفیسر تھے، انہوں نے امیر مینائی کے خطوط کا مجموعہ "مکاتیب امیر مینائی" کے نام سے ترتیب دیا تھا، اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۲۴ء میں لاٹوش روڈ لکھنؤ سے شائع ہوا تھا، اس کے آخر میں مولانا شبلی کی ایک تحریر "نوشتہ شمس العلما حضرت مولانا شبلی نعمانی" کے عنوان سے شامل ہے، مولانا کے کسی مجموعہ مضامین میں یہ تحریر شامل نہیں ہے، نہ ان کے سوانح نگاروں نے اس کا کہیں ذکر کیا ہے، ذیل میں یہ تحریر نقل کی جاتی ہے:

اردو شاعری کے اخیر تاجدار دو شخص تسلیم کیے گئے ہیں، امیر و داغ، امیر یعنی منشی امیر احمد صاحب مرحوم، شاعری کے علاوہ بہت سے کمالات کے جامع تھے، یعنی اگر وہ شاعر نہ ہوتے تب بھی ایک نامور شخص ہوتے، اس بنا پر اور نیز ان کے کمال شاعری کے لحاظ سے ضرور ہے کہ ان کی جامع اور مفصل سوانح عمری لکھی جائے، افسوس ہے کہ اب تک کسی نے اس ضروری کام کی طرف توجہ نہیں کی، یہ افسوس اس لحاظ سے اور زیادہ بڑھ جاتا ہے کہ منشی صاحب موصوف کا سلسلہ تلامذہ نہایت وسیع ہے، جس میں متعدد ایسے حضرات موجود ہیں کہ جو اس فرض کو خوبی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں، ہم اپنے معزز دوست مولوی محمد احسن اللہ خاں صاحب ثاقب کے ممنون ہیں کہ انہوں نے گو سوانح عمری لکھنے کی تکلیف نہیں اٹھائی لیکن اس کے لیے ایک بہت ضروری مصالحہ مہیا کر دیا۔

سوانح کا بڑا ضروری اور دل چسپ حصہ، اس شخص کے روزمرہ کے حالات و مقالات و خیالات ہوتے ہیں، انسان کے خیالات اور انداز طبیعت کا پتہ زیادہ تر اس کے خط و کتابت اور مراسلت سے لگتا ہے، مولوی صاحب موصوف نے جناب منشی صاحب کے خطوط جابجا سے بہم پہنچا کر ایک خاص طریقے سے مرتب کیے ہیں، جن سے اگر کوئی چاہے تو سوانح عمری کا بہت کچھ سامان حاصل کر سکتا ہے۔

کسی مصنف کے سوانح کا دوسرا ضروری حصہ اس کے کلام کی تقریظ و تنقید ہے، مولوی صاحب موصوف نے ان خطوط کے دیباچے میں مختصر حالات کے ساتھ کلام پر ناقدانہ ریویو کیا ہے

اور اس فرض کو ایسے بے لاگ طریقے سے ادا کیا ہے کہ استادی کے حقوق بھی نظر انداز کر دیے ہیں۔

میری رائے جناب منشی صاحب مرحوم کے کلام کے متعلق ممکن ہے کہ اس سے بھی زیادہ سخت ہو لیکن میں اگر ان کا شاگرد ہوتا تو ایسی بے لاگ، بے دردانہ تنقید نہ کر سکتا۔

منشی صاحب مرحوم کی لپیٹ میں مرزا داغ بھی آگئے ہیں اور جب ہمارے دوست کو استادی کا حق اظہار حق سے مانع نہ ہوا تو داغ کا کیوں پاس کرتے؟ اس بنا پر داغ کی کم زوریاں اور غلطیاں دکھلائی ہیں اور اس میں اس بات سے مدد لی ہے کہ داغ کا علمی سرمایہ کچھ نہ تھا۔

لیکن اہل عرب کا یہ خیال ہے کہ شاعر جس قدر علوم رسمی سے بے بہرہ ہوگا، اسی قدر بڑا شاعر ہوگا، یہی بات ہے کہ شعرائے جاہلیت کی برابری شعرائے اسلام نہیں کر سکتے۔

فارسی میں دیکھیے تو ہر شخص جانتا ہے کہ فردوسی، انوری اور نظامی کے مقابلے میں جاہل تھا، تاہم انوری کو اس کی عبودیت کا اقرار ہے اور نظامی کہتے ہیں:

ع کہ آراست زلفِ سخن چو عروس

جامی علم و فضل میں نظامی سے بڑھ کر ہیں، غرض شاعری کا تعلق جذبات سے ہے، معلومات سے نہیں، بہرحال جو خدمت ہمارے دوست نے اردو علم و ادب کی کی ہے، اہل زبان اس کے ہمیشہ مشکور ہوں گے اور میں اگر اہل زبان ہوتا تو یقیناً میں بھی مشکور ہوتا:

ع أحب الشاعرين ولست منهم

شبلی

۱۹/ جنوری ۱۹۱۱ء

(مکاتیب امیر مینائی، ص ۳۶۸-۳۶۶)

۴- مولانا شبلی کی وفات کے بعد ملک کے تمام موقر اخبارات و رسائل میں جہاں ان پر تعزیتی مضامین لکھے گئے وہیں مختلف شعرا مثلاً عزیز لکھنوی، سید احمد مرتضیٰ نظر، احسن مارہروی، وحشت کلکتوی وغیرہ نے انہیں منظوم خراج عقیدت بھی پیش کیا، ان تعزیتی منظومات میں سے بیش تر ہماری نگاہ سے گزری ہیں لیکن ان کے بارے میں ہمارا عمومی تاثر یہ ہے کہ ان کی ادبی سطح بہت بلند نہیں ہے، البتہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ۲۸ ویں سالانہ اجلاس منعقدہ راول پنڈی،

۱۹۱۴ء میں مولانا شبلی کی وفات حسرت آیات پر میر نثار حسین ڈپٹی مجسٹریٹ نہر، علی گڑھ نے جو فارسی قطعۂ تاریخ وفات پیش کیا تھا، اسے اس سلسلے کی تمام منظومات کے درمیان شاہکار کا درجہ حاصل ہے، واضح رہے کہ میر نثار حسین نے یہ قطعۂ وفات مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی، صاحب زادہ آفتاب احمد خاں، مولانا محمد علی جوہر اور مولانا ابوالکلام آزاد جیسے اساطین علم و ادب کی موجودگی میں پڑھ کر سنایا تھا لیکن عجیب بات ہے کہ مولانا شبلی کی کسی سوانح عمری میں اس کا حوالہ موجود نہیں، اہل علم اور ارباب ذوق کی ضیافت طبع کے لیے ذیل میں اسے نقل کیا جاتا ہے:

قطعہ تاریخ وفات حسرت آیات علامہ شبلی مرحوم

شبلی کہ بود منبعِ افضال و کانِ علم
شبلی کہ بود صاحب اوصاف بے کراں
شبلی کہ بود شمعِ شبستانِ علم و فضل
شبلی کہ بود عاقل و فرزانہ بے گماں
شبلی کہ بود بلبلِ باغِ سخن وری
شبلی کہ بود زینتِ بزمِ سخن وراں
شبلی کہ بود بلبلِ بستانِ مصطفیٰ
بُد فخر علم و فضل و ادب را بہ ذاتِ آں
آں مجمع الصفات چو خوابید زیرِ خاک
شد آفتابِ علم و ہنر در زمیں نہاں
برباد گشت گلشنِ فضل و کمال آہ
چوں مرغِ روحِ او بہ جناں کرد آشیاں
آں فاضلِ اجل چوں خرامید سوے خلد
ہر سو بپا ز درد شدہ نالۂ فغاں
یکتائے روزگار ، وحیدِ زماں گذشت

می کرد قوم ناز براں فاضلِ جہاں
تالیفِ سیرتِ نبوی نا تمام ماند
شد پارہ پارہ دفترِ امید ناگہاں
مثلش نزاد مادرِ گیتی کسے دگر
مانندِ او نیافت مگر دورِ آسماں
زیں واقعہ کہ بر دلِ من تیرِ غم نشست
زیں حادثہ کہ دیدۂ من کرد خوں رواں
گفتہ نثارِ خستہ جگر سالِ رحلتش
"بگذشت وائے شبلیِ علامہ زماں"
۱۳۳۲ھ

(کانفرنس گزٹ، نگراں پروفیسر ریاض الرحمان خاں شروانی، جنوری ۲۰۰۵ء ص۹)

۵- اب یہ مقالہ ختم ہوا چاہتا ہے لیکن آخر میں ہم اہل علم حضرات کی توجہ اس طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں کہ علمی و تحقیقی نگارشات میں حوالہ جات کا موجودہ طریقہ کہ ایڈیشن، مطبع نیز جلد اور صفحے کی قید کے ساتھ ماخذ کی نشان دہی کی جائے، اردو میں اس کے آغاز و رواج کا سہرا علامہ شبلی نعمانی کے سر ہے، اس کی توضیح یہ ہے کہ مولانا کے زمانے تک اہل قلم اور مصنفین کے یہاں اجمالی حوالوں کا رواج تھا، چنانچہ سرسید احمد خاں، محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد اور حالی وغیرہ کی تصانیف میں ایڈیشن، مطبع، جلد اور صفحہ نمبر کی صراحت کے بغیر صرف اجمالی حوالے ملتے ہیں، اسی طرح نزهة الخواطر کی آٹھوں جلدوں میں "کما فی تاریخ مکرم"، "کما فی ضیاء محمدی" کی طرح اجمالی حوالے ہی دیے گئے ہیں، جلد اور صفحہ نمبر کی تصریحات کہیں مندرج نہیں، علامہ شبلی نے مستشرقین یوروپ کی تصانیف کے مطالعے کے بعد اپنی تحریروں میں تفصیلی حوالوں کا سلسلہ شروع کیا، پھر اسے رواج اور قبول عام حاصل ہوا، اس لیے تفصیلی حوالہ جات کے طریق کار کو علامہ شبلی کی اولیات میں شمار کرنا چاہیے، شبلی نے تقریباً سو سال پہلے کہا تھا:

سالہا گوشِ جہاں زمزمہ زا خواہد بود　　زیں نواہا کہ دریں گنبدِ گرداں زدہ ام

بلاشبہ وہ اس دعوے میں حق بہ جانب تھے، چنانچہ آج بھی ہر طرف ان کے زمزمے گونج رہے ہیں۔

ماٰخذ

افکار و شخصیات، ظفر احمد صدیقی، رام پور رضا لائبریری، رام پور، ۲۰۰۶ء۔

امتحان الالباء لکافۃ الاطباء، مترجمہ حکیم بدرالدین دہلوی، مصلح المطابع، دہلی، مئی ۱۹۰۰ء۔

حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، معارف پریس، اعظم گڈہ، طبع اول ۱۹۴۳ء۔

شبلی، ظفر احمد صدیقی، ساہتیہ اکادمی، طبع دوم، ۱۹۹۳ء۔

شبلی معاصرین کی نظر میں، مرتبہ ظفر احمد صدیقی، اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ، طبع اول، ۲۰۰۵ء۔

مقالات شبلی جلد ہشتم، معارف پریس، اعظم گڈہ، ۱۹۳۸ء۔

مکاتیب امیر مینائی، مرتبہ احسن اللہ خاں ثاقب، مطبعہ ادبیہ، لاٹوش روڈ لکھنؤ، طبع دوم، ۱۹۲۴ء۔

ماہ نامہ الندوہ، لکھنؤ، ایڈیٹر اکرام اللہ خاں ندوی، شمارہ اپریل، ۱۹۱۵ء۔

کانفرنس گزٹ، علی گڑھ، نگراں پروفیسر ریاض الرحمان خاں شروانی، جنوری، ۲۰۰۵ء۔

کلاسیکی شاعری کی حالیہ تحقیق

معیار و کردار

پروفیسر عبدالحق

میں دہلی اردو اکیڈمی کو تبریک پیش کرتا ہوں کہ وہ اب احتسابی سرگرمیوں میں مصروف ہے، تنقید و تحقیق کی یافت اور عبرت کے تجزیہ پر یہ توجہ قابل ذکر ہے، تنقید کے محصولات اور محرومیوں سے قطع نظر تحقیقی تفاعل بھی تکلیف دہ ہے، پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ادب اور سماج پر نقاد اور نیتا کی اجارہ داری پر طنز کیا تھا، تیسرے قبیلے یعنی اساتذہ کے ہاتھوں تحقیق کا استحصال بھی ان سے زیادہ عبرت ناک ہے، تنقید کی مقبولیت اور تحقیق سے چشم پوشی بھی ایک حقیقت ہے، اگرچہ دانش گاہوں میں تحقیق کے طلب گاروں کی تعداد میں ہر تیسرے سال صدفی صد کا اضافہ ہو رہا ہے، موضوعاتی سطح پر اشعار و افسانے کے تنقیدی تجزیے پر ہی ساری توجہ ہے، ترتیب و تدوین کی نمائندگی صرف تین فی صد ہے، شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی کی حالیہ مطبوعہ فہرست میں ۱۹۵۹ء سے ۲۰۰۵ء تک کے منظور شدہ مقالوں کی مجموعی تعداد ۱۲۰/ ہے جن میں صرف چار موضوع ہی متن کی تدوین سے متعلق ہیں، دیوان میر اثر، کلام ممنون، دیوان یقین اور دیوان شاکر ناجی اس کے بعد کوئی کام متن سے متعلق سامنے نہیں آیا، علامہ اقبال کو:

شیر مردوں سے ہوا بیشۂ تحقیق تہی

کے لیے شکوہ سنج نہیں ہونا چاہیے تھا، اب تو پیشۂ تحقیق ذریعۂ عزت، وسیلۂ زر اور فضیلت کی دست گاہ اور دستار دونوں کی علامت ہے، علمی خشک سالی کے دور میں تحقیق کی شادابی اور ارزانی بھی کسی بوالعجبی سے کم نہیں ہے، تقریباً سبھی دانش گاہوں کا یہی حال ہے۔

سابق صدر شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی، دہلی۔

کلاسیکی ادب کی تحقیق و تلاش میں اسلاف کی دیدہ وری اور دروں بینی آج بھی مثل شعاع آفتاب ہے، جس طرح صدی گزر جانے کے باوجود تنقید حالی و شبلی پر سبقت نہ حاصل کر سکی، انتقاد کے شہریاروں پر چند برسوں میں ہی گہن لگ جاتا ہے، تحقیق کے چہار درویشوں کی دارائی اور رہ نوردی کی قندیل اب بھی روشن ہے۔

بزرگوں کی بصیرت کو آفریں ہو کہ ان کی بہ دولت کلاسیکی شاعری کی بازیافت ممکن ہو سکی، اس دریافت سے ادبی تاریخ کی قدامت اور لسانی تصورات میں تبدیلی آئی ہے، ایک وقت تھا کہ ولی کو اردو شیش محل کا معمار اول سمجھا جاتا تھا، مثنوی کدم راؤ پدم راؤ یا بکٹ کہانی کی بازیابی نے تاریخ بدل دی، راقم نے سہولت کے لیے دکنی ادب سے صرف نظر کر کے شمالی ہند کے دور اول یعنی عہد آبرو حاتم سے ابتدا کی ہے۔

ولی کے بکھرے ہوئے بیشتر مطبوعہ اور غیر مطبوعہ نسخوں کی مدد سے ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے ۱۹۴۵ء میں کلیات ولی مرتب کیا تھا، کلام ولی کے کئی انتخابات شائع ہوئے ہیں، جو فرمائشوں اور ضرورتوں کے تحت منظر عام پر آئے ہیں، بعض انتخابات میں متن کی مسخ شدہ صورتیں بھی دیکھنے میں آئی ہیں، ان میں سب سے بہتر انتخاب ڈاکٹر ظہیر الدین مدنی کا ہے اور سب سے ناقص انتخاب ڈاکٹر شارب ردولوی کا ہے، یہ دہلی یونی ورسٹی کی لکچررشپ کی آسامی کے لیے راتوں رات تیار کیا گیا تھا، مطالعۂ ولی میں مختصر مقدمہ اور کلام ولی دونوں مایوس کن ہیں، چند سال قبل ولی کے مزار کی مسماری کی تلافی کے طور پر بڑے اعلانیے جاری ہوئے تھے، لگتا ہے کہ شاید منصوبہ بھی مزار کی طرح منہدم ہو گیا، لاہور یونی ورسٹی سے فیضان دانش نے ۱۹۷۳ء میں کلام ولی کا لسانی اور فنی مطالعہ کے موضوع پر مقالہ لکھا تھا۔

یہ کہنا مناسب نہ ہوگا کہ کلاسیکی شاعری کے اس دور کی بازیافت پر خاص توجہ دی گئی ہے، وہ دوسرے ادوار پر دیکھنے کو نہیں ملتی، ضمناً یہ عرض کروں کہ امیر خسرو (۱۲۳۵-۱۳۲۵ء) سے منسوب کلام مشتبہ ہی نہیں ہے بلکہ اسے مسترد کیا جا چکا ہے، حافظ محمود شیرانی سے لے کر ڈاکٹر گیان چند جین تک بھی نے اسے الحاقی قرار دیا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ ڈاکٹر جین نے آخری دنوں میں پلٹ کر اپنے ہی موقف کی تردید کی ہے، انہوں نے ہندوی کلام کو اردو تحقیق کا ارجن بان یا اگنی

میزائل قرار دیا ہے، یہ ان کے ذہنی تضاد اور غلط بخشی کی بڑی مکروہ مثال ہے، تحقیق میں ادعائیت سے مدعی اور گواہ دونوں بے آبرو ہوتے ہیں۔

کلاسیکی شاعری کے آغاز وارتقا میں مرزا مظہر جان جاناں کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، ۱۹۶۱ء میں ڈاکٹر عبدالرزاق قریشی نے ان کا اردو کلام شائع کیا تھا، ڈاکٹر خلیق انجم نے بھی اس سلسلے کو آگے بڑھایا، مرزا مظہر پر ان کا تحقیقی مقالہ بھی داخل کیا گیا تھا، کلاسیکی شاعری میں دیوان فائز کی اشاعت (۱۹۶۵ء) ایک اہم کارنامہ ہے، اگرچہ ڈاکٹر مسعود حسن رضوی کی اولیت کے دعوے کو قاضی عبدالودود نے مدلل طور پر مسترد کیا ہے، ڈاکٹر محمد حسن نے بھی قاضی صاحب مرحوم کی توثیق کرتے ہوئے آبرو حاتم کی اولیت کو تسلیم کیا ہے، ڈاکٹر محمد حسن نے دہلی اردو اکیڈمی کی ایما پر کلام فائز کے نام سے ۱۹۹۱ء میں ایک انتخاب شائع کیا ہے جو دیوان فائز سے ماخوذ ہے، متن بھی وہی ہے اور مقدمہ بھی مختصر ہے، توقع تھی کہ اس پر ایک بھرپور مقدمہ لکھا جاتا، شاید انتخاب میں اوراق کے اعداد حائل تھے۔

دیوان فائز کے بعد دیوان آبرو کی ۱۹۶۳ء میں اشاعت کلاسیکی شاعری کی ایک دوسری بڑی دریافت تھی، ۱۹۶۴ء میں اس کا اشاعت ثانی سامنے آیا اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۹۰ء میں ترقی اردو بورڈ نے پیش کیا، اس اشاعت میں بھی نقائص موجود ہیں، چھ قلمی نسخوں کی تلاش ایک قابل ستائش کارنامہ ہے مگر ان سے متن کی تیاری میں خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا گیا، ۱۹۷۷ء میں راقم نے شاہ حاتم کے قدیم دیوان کا انتخاب شائع کیا تھا، اس کے مقدمے میں دیوان آبرو کے ساتویں نسخے کا ذکر بھی کیا گیا تھا جس میں اشعار کی تعداد اور اختلاف نسخ کا تذکرہ بھی تھا، دیوان آبرو کی تیسری اشاعت میں اس نسخے سے فائدہ اٹھایا جاسکتا تھا مگر مرتب نے ایسا نہیں کیا جب کہ یہ کتاب موصوف کے نام معنون بھی کی گئی تھی، یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا، ڈاکٹر محمد حسن نے نسخۂ کلکتہ کی مدد سے "مثنوی در موعظۂ آرائش معشوق" کو نقل کیا ہے، جس میں ۱۲۵/ اشعار ہیں، راقم کے نسخے میں ۱۳۴/ اشعار محفوظ ہیں، مرتب نے ذکر کیا ہے کہ نسخۂ کلکتہ بہت غلط سلط ہے، شاید اسی سبب مطبوعہ دیوان میں مثنوی کے کئی مصرع نظر انداز کردیے گئے ہیں، یہ پڑھے نہیں جاسکے ہیں، ناچیز ذاتی نسخے کی مدد سے ان مصرعوں کو مکمل کرسکا ہے، حسب ذیل اشعار کے پہلے مصرع مرتب نے

نقل کیے ہیں اور دوسرے مصرعوں کی تکمیل ناچیز کے نسخے سے ممکن ہوسکی ہے۔

تو بجن دل میں مری باتوں کو سن — خوب روئی کی اگر ہے دل میں دھن

کج ہو اپنے سج اوپر اکڑاؤ پر — لہر جو ایک پے جا ہو سجاؤ پر

یہ نہیں نوبت تو پھر تلوار باندھ — یا کہ پیچا پست تلوار باندھ

گاہے گاہے ڈال لیجے سر اوپر — خوب لگتا ہے دوپٹہ ہے اگر

بولنا باہم اوسے معراج ہو — بات کرنے کا اگر محتاج ہو

اس شعر میں مصرع اول نقل شدہ نہیں ہے صرف مصرع ثانی ہی درج ہے۔

گرم کیجیے تو کیجیے دوستی — بزم ہو تو نرم کیجیے دوستی

ان کے علاوہ بہت سے اشعار ہیں جن کا متن کچھ کا کچھ ہوگیا ہے، جیسے سر بور ہے کہ جگہ سر توڑ دی ہے، مجرا اسلام کو کار اسلام لکھ دیا گیا ہے، جمیت کی جگہ صحبت، بھول جا کے بدلے ہوئے جا داخل متن ہیں، غرض یہ ترتیب غیر تشفی بخش ہے، موصوف تنقید کے مرد میدان ہیں، تحقیق ایک دوسری نوع کے طلب گار مرد کا مطالبہ کرتی ہے، انہوں نے کلیات سودا بھی مرتب کیا تھا، جو دیوان آبرو سے کہیں زیادہ اسقام سے پُر تھا، شاید اسی وجہ سے اسے تلف کردیا گیا، ہاں اس کا مقدمہ جو کتابی صورت میں شائع ہوا وہ سودا شناسی میں بڑی اہمیت کا حامل ہے، اگرچہ مختصر ہے مگر اپنی جامعیت میں بھی بے نظیر ہے۔

شاکر ناجی کا دیوان پہلی بار ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر فضل الحق مرحوم نے شائع کیا تھا، یہ کام بھی زیادہ معیاری نہ تھا، اسی سال راقم کو اپنے وطن سے دیوان شاکر ناجی کا ایک قلمی نسخہ دست یاب ہوا، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی مرحوم کی بیگم ڈاکٹر افتخار صدیقی نے اس نسخے اور ڈاکٹر فضل الحق مرحوم کے پاس موجود دونوں نسخوں کی مدد سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی جو بعد میں شائع بھی ہوا، یہ پہلی اشاعت سے بہتر ہے، پھر بھی اسے تدوین کا بہت اچھا نمونہ نہیں کہہ سکتے، میرے ذاتی مخطوطے کو نسخۂ اعظم گڈھ کا نام دیا گیا، شاید اس میں کچھ مصلحت سمجھی گئی ہو۔

ڈاکٹر شمیم احمد نے ۱۹۷۵ء میں دیوان یکرو کا متن شائع کیا اور ۱۹۷۸ء میں دیوان سجاد اشاعت پذیر ہوا، کلاسیکی شاعری کے گم شدہ سلسلے مربوط ہونے لگے، ۱۹۷۷ء میں راقم نے شاہ حاتم

کے قدیم دیوان کا ایک انتخاب شائع کیا جو شاہ حاتم کے سب سے قدیم دریافت شدہ نسخے پر منحصر تھا، عنقریب پورا انتخاب اضافے کے ساتھ چوتھی بار شائع ہو رہا ہے، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار نے لاہور سے دیوان زادہ شائع کر کے کلاسیکی متن کی تدوین میں ایک نمایاں کام انجام دیا ہے، دیوان زادہ کے دو مزید قلمی نسخوں کی دریافت نے دوسری تدوین کی راہ پیدا کی ہے، دیکھیے ہمارے قبیلے کے کس کشتۂ تحقیق کے نام قرعۂ فال نکلتا ہے۔

ڈاکٹر اکبر حیدری نے دیوان زادہ کے ایک مخطوطہ کے تعارف میں جو اشعار نقل کیے ہیں ان میں ایک جگہ متن میں ایسی تحریف کی ہے جو قابل نفرت ہے اور ننگِ تحقیق بھی، موجودہ دور میں تحقیق کے نام پر کذب و کتمان کو بھی بڑا فروغ ملا ہے، ان میں سب سے مکروہ مثال موصوف کی ہے، ان کے تحقیقی دعوے اکثر و بیشتر غلط اور گم راہ کن ہوتے ہیں، حاتم کا شعر یوں ہے:

شاہِ مرداں کی شجاعت میں یقین سے حاتم
حملۂ حیدری اور دیکھ لے خیبر نامہ

محقق موصوف نے متن کو مسخ کر کے اس طرح لکھا ہے:

شاہِ مرداں کی شجاعت میں یقین سے حاتم
قصۂ حیدری اور دیکھ لے حیدر نامہ

حملۂ حیدری کو قصۂ حیدری اور خیبر نامہ کو حیدر نامہ میں تبدیل کر دینا تحریف کی مذموم مثال ہے، یہ الفاظ خلیفۂ چہارم اور دامادِ رسولؐ کی شجاعت کے عظیم واقعے کے ترجمان تھے، جسے موصوف نے قصہ کہانی قرار دیا ہے، مزید حماقت کی ہے کہ ان دو لفظوں کی تشریح میں حاشیہ میں لکھا ہے کہ یہ دو کتابوں کے نام ہیں جو حاتم کی نظر سے گزر چکے تھے، متن کی تحریف کی مثالیں موجود ہیں مگر یہ کوشش غلط اور تحقیق کے آداب کے خلاف ایک سنگین جرم ہے، ساتھ ہی بد دیانتی بھی، یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دونوں کتابیں بہ صورت مخطوطات شاہ حاتم کے مطالعہ میں کبھی نہیں رہیں، یہ غلط بیانی بھی گم راہ کن ہے، زعم تحقیق میں اکثر دیانت داری کا دامن چھوٹ جاتا ہے۔

فرحت اللہ بیگ نے ۱۹۳۰ء میں دیوان یقین (وفات ۱۷۵۵ء) کو پہلی بار علی گڑھ سے شائع کیا تھا، انہوں نے تیرہ نسخوں کی مدد سے یہ دیوان مرتب کیا تھا اور اب تک تقریباً سترہ نسخوں

کی نشان دہی کی جا چکی ہے، ڈاکٹر فرحت فاطمہ نے دوسرے نسخوں کی مدد سے ترتیب دے کر ڈگری حاصل کی اور ۱۹۹۵ء میں دہلی سے شائع بھی کیا، اس مطبوعہ نقش ثانی میں اسقام موجود ہیں، یہ دونوں فرحت اللہ بیگ کے مرتب دیوان یقین سے بہت فروتر ہے، گو کہ یہ ۶۵ سال بعد مرتب کیا گیا ہے مگر بڑی غیر سنجیدگی کا ثبوت دیا گیا ہے، متعدد نسخوں کا ذکر کیا گیا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان نسخوں سے قطعی طور پر کوئی مدد نہیں لی گئی ہے، دو ایک مثالیں ملاحظہ ہوں، فرحت اللہ بیگ کے یہاں دسویں غزل کا مصرع اولی حسب ذیل ہے:

ہوئے ہیں چور میرے استخواں پتھروں سے لڑکوں کے

اس مصرعے کے عوض دوسرا متن شامل کیا گیا ہے جو مفہوم کے اعتبار سے درست نہیں ہے، ایک مصرع ہے:

آ گئی تھی راس مجنوں کو بیاباں کی ہوا

راس کی جگہ راست لکھا گیا ہے، ایسے ہی چاک کی جگہ خاک، حالِ دل کی جگہ بے حال، نالوں کی جگہ لگاؤں، شیون کی جگہ رشتوں کو ترجیح دے کر متن کو مسخ کیا گیا ہے، عجلت پسندی اور عدم سنجیدگی کی وجہ سے یہ مطبوعہ نسخہ ناقابل اعتماد ہے۔

دیوان بیان (وفات ۱۷۸۹ء) سب سے پہلے ڈاکٹر ثاقب رضوی نے مرتب کر کے سند حاصل کی تھی، اگرچہ اس مطبوعہ دیوان میں سینکڑوں غلطیاں موجود ہیں اور تدوین کے کام پر شرم آتی ہے، بعد ازاں ڈاکٹر ارجمند آرا نے دیگر نسخوں کی مدد سے اسے ۲۰۰۴ء میں مرتب کر کے شائع کیا اور اس دیوان کو اعتبار بخشا ہے، یہ کام نہرو یونی ورسٹی کے زیر اہتمام تحقیقی مقالے کے طور پر انجام دیا گیا ہے، دہلی یونی ورسٹی میں ڈاکٹر افسری افتخار نے دیوان ممنون مرتب کیا تھا اور بہت اچھا کام تھا مگر شائع نہ ہو سکا، کلیات قائم چاند پوری ڈاکٹر اقتدار حسن مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۵ء میں شائع کرا چکے ہیں، دیوان سوز، دیوان بقا اور دیوان قائم (وفات ۱۷۹۳ء) کو شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا، دیوان ممنون کو ڈاکٹر منشاء الرحمان نے بھی پیش کیا تھا مگر وہ تدوین کا کام نہ تھا۔

کلاسیکی شاعری کے دوسرے دور کا بھرپور احاطہ نہیں ہو سکا ہے، سودا (۱۷۰۶-۱۷۸۱ء)

کا کلیات مرتب نہ ہوسکا، ۱۹۶۴ء میں ڈاکٹر خورشید الاسلام نے کلام سودا شائع کیا تھا، وہ تدوین سے عاری ہے، ڈاکٹر محمد حسن کے علاوہ ڈاکٹر شمس الدین نے کلیات ۱۹۷۶ء میں شائع کیا، جو مجلس ترقی ادب لاہور کی پیش کش تھی، ڈاکٹر عتیق احمد صدیقی مرحوم کا انتخاب بھی غیر معیاری ہے، رشید حسن خاں مرحوم کا انتخاب بہت بہتر اور کافی حد تک اطمینان بخش ہے، وہ تدوین کے کارشناس اور متون کے ماہر تھے، ان کے دوسرے کام بھی معتبر اور مفید ہیں، اس کے برعکس ڈاکٹر شارب ردولوی کا انتخاب سب سے زیادہ غلطیوں اور گم راہیوں کا مجموعہ ہے، موصوف نے انتہائی غیر ذمہ داری کا ثبوت فراہم کیا ہے، الحاقی کلام کو بھی اس انتخاب میں جگہ دی گئی ہے، یہ سودا کے ساتھ ہی نہیں یہ اردو ادب کے ساتھ بدمذاقی کی بڑی مکروہ مثال پیش کرتا ہے، متن بھی مسخ شدہ پیش کیا گیا ہے اور وزن سے خارج اشعار بھی نقل کیے گئے ہیں، صحت متن اور صحت املا کو نظر انداز کیا گیا ہے، یہ مجموعہ نقائص اور مسخ شدہ متن کی مثال ہے، سودا کی لفظیات پر جے پور سے ڈاکٹر نعیم نے چند سال قبل اچھا مقالہ پیش کیا، دو سال قبل علی گڑھ سے بھی کلام سودا پر تحقیقی مقالہ لکھا گیا، یہ بھی غیر معیاری تھا، دہلی یونی ورسٹی میں بھی شرح قصائد سودا و ذوق پر جو کام ہوا وہ بہت ہی سرسری ہے، سودا جیسے عہد ساز اور آج تک متاثر کرنے والے آہنگ کے موجد کا کلام تدوین کا متقاضی ہے، ہم شکر گزار ہیں پروفیسر نسیم احمد کے جنھوں نے غزلیات سودا مرتب کر کے تدوین کی تاریخ میں پرشکوہ باب کا اضافہ کیا ہے اور تدوین و ترتیب کی ایک بیش بہا تمثیل قائم کی ہے، اسی طرح ترقی اردو بورڈ سے مطبوعہ ان کا دیوان درد (۱۷۲۰-۱۷۸۵ء) بھی ایک گراں قدر مثالی تدوین ہے، اس دور کے دوسرے اہم شاعر کا مختصر کلام بھی تشنہ تدوین و تکمیل تھا، ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی اور رشید حسن خاں مرحومین کے مرتبہ دیوان درد پر ڈاکٹر نسیم احمد نے بڑے علمی اضافے کیے ہیں، تعلیمی حلقوں سے باہر بعض بزرگ اردو اساتذہ کی کارکردگی یا متن شناسی پر ہنستے تھے، شکر ہے کہ ڈاکٹر نسیم احمد کی یہ دونوں تالیفات اردو اساتذہ کی آبرو کی محافظ قرار دی جاسکتی ہیں، ایک اہم مخطوطہ کی دریافت کے بعد ڈاکٹر فضل امام رضوی نے دیوان درد مرتب کیا تھا جس میں متن سے متعلق قابل افسوس غلطیاں شامل ہوگئی تھیں، ان کی نشان دہی بھی ڈاکٹر نسیم نے اپنے تبصرہ میں کی تھی، کلام میر کی شرحیں کئی جلدوں میں لکھی جاسکتی ہیں مگر متن کا تعین ہنوز مسئلہ جدید و قدیم بنا ہوا ہے، مختلف لوگوں نے انتخابات شائع

کیے ہیں اور کلیات بھی مگر تدوین کی توفیق نہ مل سکی، اردو کونسل کی سرپرستی میں شائع ہونے والا ڈاکٹر احمد محفوظ کا مرتبہ کلام میر معیاری تدوین کی مثال نہیں پیش کرتا، تاہم دوسری مطبوعات سے مفید اور بہتر ہے، یونی ورسٹی سطح پر ڈاکٹر فرید احمد برکاتی نے میر کی فرہنگ اور ڈاکٹر قاضی افضال نے لسانی مطالعہ پر توجہ دی تھی، میر پر مزید تحقیقات کی ضرورت ہے، ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی، ڈاکٹر جمیل جالبی، شمس الرحمان فاروقی، ڈاکٹر حامدی کشمیری، ڈاکٹر نثار احمد فاروقی وغیرہ نے انتقادی ادب کا ایک قابل قدر سرمایہ پیش کیا ہے جو میر شناسی کے تجزیہ کی دعوت دے رہا ہے۔

اسی طرح غالبیات کا بھی جائزہ لیا جانا چاہئے، بھلا ہو مولانا عرشی مرحوم کا جنھوں نے ”دیوان غالب“ کی تدوین کو ترتیب کا شاہکار بنادیا، غالب کا فارسی دیوان جسے پروفیسر عابدی (پاکستان) نے شائع کیا، وہ بھی مجموعۂ اغلاط ہے، ہندوستان سے جناب امیر حسن نورانی نے منشی نول کشور سے جو کلیات غالب شائع کرایا وہ بھی ناقص ہے، ڈاکٹر تنویر احمد علوی نے ذوق و نصیر کا کلام مرتب کر کے ایک اچھی مثال قائم کی ہے، مومن و ظفر کا کلام ہنوز کسی مرد تحقیق کا منتظر ہے، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی نے دیوان مومن ضرور شائع کرایا اور شرح بھی کی مگر تدوین کلام کا کام نہ ہوسکا، ۱۹۷۰ء میں اس کا پانچواں ایڈیشن شائع ہوا تھا، غالب پر شور و غوغا بہت ہے، وہ بھی بزرگوں کی ذات تک، دہلی یونی ورسٹی کا شعبۂ اردو غالب کے مطالعہ پر متوجہ تھا، ۱۹۶۵ء سے ۲۰۰۵ء تک صرف ایک طالب علم ڈاکٹر محمد جاوید ہی ”غالبیات کا تنقیدی جائزہ“ کے موضوع پر تحقیق کرسکا، وہ بھی میری ایما اور اصرار پر، پروفیسر نذیر احمد اور پروفیسر عابدی میری درخواست پر متفق تھے کہ غالب پر کام کرنے والے طالب علم کو کم سے کم پانچ ہزار کا وظیفہ عنایت کیا جائے، موضوع کی منظوری کے بعد دونوں حضرات نے معذرت کی، اساتذہ کے ساتھ ادارے بھی کورِ نظر کے شکار ہیں، اس کے برعکس اقبالیات کے جائزے پر اب تک چار کام ہوچکے ہیں اور بے منتِ غیر، غالب کے نام پر داغ و دبیر کے لیے دینار و درم کا دفینہ لٹایا جاسکتا ہے مگر مطالعہ غالب کے لیے وظیفے کا اجرا دختر رز کی طرح حرام ٹھہرایا دیا گیا ہے، عصری حالات میں تحقیق تہلکہ برپا کررہی ہے اور ادبی تحقیق مبردص و مہلک قرار دی جاچکی ہے۔

یہ کہتے ہوئے کرب محسوس کرتا ہوں کہ ہماری تحقیق انحطاط سے دوچار ہے، خاص طور پر

اساتذہ کی فکر مصلوب ہو چکی ہے، تن آسانی اور آسائش کی ارزانی نے مطالعے اور مزاولت سے نفرت دلادی ہے، کلاسیکی ادب سے گریز اور افسانوی وشعری تجزیہ سے دل بستگی نے ایک تشویش ناک صورت حال پیدا کی ہے، اس وبائے عام میں رشید ومرشد دونوں مبتلائے آلام ہیں، بے بصیری دیکھیے کہ قصیدہ ومرثیہ کے ساتھ اب اقبال کو بھی نصاب سے نکالنے کی مہم شروع کی جاچکی ہے، ایک مرکزی یونی ورسٹی میں پوری فیکلٹی میں پہلی بار پہلا امتیازی مقام حاصل کرنے والے طالب علم کو اقبال پر ریسرچ کرنے سے محروم کردیا گیا، طالب علم تحقیق سے ہی دست بردار ہوگیا، دہلی اردو اکیڈمی کی فیض بخشی سے بھی درخواست ہے کہ وہ ہر عنوان اور اشاعت پر امداد و اعانت میں محتاط ہو، ہماری تحقیق بے شتر ہے اور بے سمت بھی، اسے صاحب نظر ساربانوں کی ضرورت ہے، اس مذاکرے کی مدد سے آئین تحقیق کے آداب مقرر کیے جاسکتے ہیں جسے کم سے کم دارالخلافہ دہلی کی دانش گاہوں میں اسے نافذ کیا جاسکتا ہے، کم سے کم دہلوی متون کی باز آفرینی کے لیے، تحقیق نہ حرف آخر ہے اور نہ جامد، مختلف علوم کے ساتھ مخطوطات اور مواد کی دریافت سے پرانے کلیے بدلتے رہتے ہیں اور نئے مباحث بھی سامنے آتے ہیں، صحیح کا غلط اور اس کے برعکس ہوتے رہنا تحقیق کے خشت وخمیر میں شامل ہے، نتائج سے بے تعلق ہوکر سرگرمیاں جاری رہیں، ادبی تحقیق میں متون کی تدوین وتسوید ہماری پہلی ترجیح ہے، اسی بنیاد پر تنقید کی فلک بوس عمارت تعمیر کی جاسکتی ہے، ادبی مطالعہ میں متون کی اہمیت چند در چند ہوتی ہے، اسالیب کے ساتھ افکار کی معنویت بھی اصل عبارت پر ہی موقوف ہے، ورنہ مجر اسلام کا کار اسلام پڑھا جائے گا اور اس تبدیلی کلام سے تشویش ناک صورت حال پیدا ہوتی رہے گی، سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرنے کی تنقیدی ادعائیت کو متن شناسی کی فکر اور فرزانگی میں پہل کرنی چاہیے۔

اگر نہ سہل ہوں تجھ پر زمیں کے ہنگامے
بری ہے مستیٔ اندیشہ ہائے افلاکی

احمد آباد میں علم وفن کا ایک مثالی مخزن
شاہ پیر محمد لائبریری

ڈاکٹر محمود حسن الہ آبادی

انفارمیشن ٹکنالوجی (information technology) کے اس دور میں بھی جب کہ دنیا بھر کی کتابیں پرسنل کمپیوٹر پر دست یاب ہیں، کتابوں اور لائبریریوں کی اہمیت کم نہیں ہوئی ہے، اہل علم کے ذوق کی تسکین اوراق پر تحریر کردہ مواد ہی سے ہوتی ہے، کیوں کہ آنکھوں کی راہ سے یہ مواد دماغ کے پردے پر نقش ہوجاتا ہے، قدیم زمانہ میں اہل علم کتابوں کے اپنے ذخیرے رکھتے ہوئے مکاتب اور درس گاہوں میں بھی کتب خانے ہوا کرتے تھے، علم کے شائق بادشاہوں نے بھی عظیم کتب خانے قائم کیے اور ان کی سرپرستی کی، چھاپہ خانہ (printing press) کی ایجاد سے پہلے کتابیں ہاتھ سے لکھی جاتی تھیں، املا اور نقل کی وجہ سے ایک ہی کتاب کے مختلف نسخوں میں بہت سے اختلافات بھی در آتے تھے، نسخوں کا یہی اختلاف ہے جسے رفع کرنے کے لیے ارباب تحقیق اب مختلف لائبریریوں میں منتشر الگ الگ نسخوں کو سامنے رکھ کر کتاب کی تصحیح وترتیب کا کام انجام دیتے ہیں اور یونی ورسٹیاں مخطوطات کی تصحیح کرکے انہیں مرتب (edit) کرنے والوں کو ڈاکٹریٹ کی ڈگریوں سے نوازتی ہیں۔

بڑی لائبریریاں عموماً حکومت کی سرپرستی کی محتاج ہوا کرتی ہیں، قومی لائبریریوں میں پریس ایکٹ کے تحت ملک کی مطبوعہ تمام کتابوں کے دو نسخے بھیجنا قانوناً ضروری ہے، ہندوستان میں یہ قومی لائبریریاں (National Libraries) کولکاتا، ممبئی، چنئی (مدراس) اور دہلی میں ہیں لیکن لائبریریوں کی اصل اہمیت قدیم کتابوں کے ذخیروں سے ہوتی ہے جو عموماً مخطوطات کی شکل میں ہوتی ہیں،

بی-۱۰۴، بدر منزل، پٹیل نگر، وی پی ناکا، بھیونڈی (تھانے)۔

انگریزوں اور یورپ کے دوسرے استعمار پسندوں نے اپنے دور حکومت میں نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام اسلامی دنیا کے عظیم کتب خانوں سے مخطوطات کے ذخیرے چوری کر کے انہیں اپنی لائبریریوں میں سجادیا، لندن کے برٹش میوزیم (British Museum Library) کے علاوہ پیرس اور جرمنی کے کئی کتب خانے اس چوری کے مال سے مالا مال ہیں، شاعر مشرق نے اسی کا ماتم یوں کیا ہے

مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آباء کی — جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سی پارہ

غنی روز سیاہ پیر کنعاں را تماشہ کن — کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

اس کھلے ظلم اور کتاب دزدی کے باوجود الحمدللہ ہندوستان میں کئی کتب خانے ایسے ہیں جہاں مخطوطات کے بیش بہا جواہر محفوظ ہیں، ان کتب خانوں میں اولین مقام پٹنہ کی خدابخش اورینٹل لائبریری کا ہے جو حکومت ہند کے زیر انتظام ہے، دوسرا سب سے بڑا مخطوطات کا ذخیرہ رضا لائبریری، رام پور ہے، مخطوطات کی تیسری بڑی لائبریری حیدرآباد میں سالار جنگ میوزیم کی لائبریری اور چوتھی حیدرآبادی کی آصفیہ (گورنمنٹ) لائبریری ہے جو حکومت کی بدانتظامی کا شکار ہے، مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی اور نئی دہلی میں ہمدرد کی لائبریری میں مخطوطات کے عظیم ذخائر محفوظ ہیں، گورنمنٹ لائبریریوں میں صرف کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری میں مخطوطات کی تحفیظ کی گئی ہے، ایشیاٹک سوسائٹی ممبئی نے عربی، فارسی اور اردو مخطوطات کے ساتھ وہ ظالمانہ سلوک کیا کہ یہ پورا ذخیرہ تلف ہوگیا لیکن جامع مسجد ممبئی کی محمدیہ لائبریری میں مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ ہے، اس وقت مغربی ہندوستان میں مخطوطات کا سب سے بڑا ذخیرہ حضرت پیر محمد شاہ لائبریری احمد آباد میں ہے جہاں چار ہزار سے زیادہ مخطوطات کی تحفیظ کی گئی ہے، خوش آیند بات ہے کہ یہ لائبریری بہ جائے حکومت کے ایک ٹرسٹ کے زیر انتظام ہے جس کی آمدنی خاطر خواہ اور اس کے ٹرسٹیان باذوق ہیں، مغل دور حکومت سے پہلے گجرات سلاطین دہلی کا ایک صوبہ اور بعد میں شاہان گجرات کے تحت رہا ہے، ان کی سرکاری زبان فارسی تھی، پورا خطہ گجرات اور خاص طور سے احمد آباد بزرگوں اور ولیوں کا مسکن رہا ہے، اس لیے اس شہر میں تصوف کی بیش از بیش قدردانی رہی اور حقائق و معارف تصوف سے متعلق بے شمار کتابیں لکھی گئیں جو چند ایک کو چھوڑ کر سبھی غیر مطبوع ہیں۔

حضرت پیر محمد شاہ (۱۱۰۰ھ تا ۱۱۶۳ھ) ایک صاحب دل اور صاحب نسبت بزرگ تھے، جو بیجاپور سے ترک وطن کر کے احمد آباد آگئے تھے، آپ کا مختصر ذکر مرأۃ احمدی (طبع اول ممبئی ۱۳۰۷ھ اور طبع ثانی احمد آباد ۱۹۳۰ء) میں موجود ہے، آپ شاعری بھی کرتے تھے اور اقدس تخلص فرماتے تھے، مولانا ابوظفر ندوی نے آپ کی سوانح "تذکرۂ اقدس" کے نام سے قلم بند کی تھی جو ۱۹۳۴ء میں مطبع معارف اعظم گڈھ میں طبع ہوئی تھی اور اب حضرت پیر محمد شاہ لائبریری کی طرف سے دوبارہ شائع ہوئی ہے، تذکروں میں مرقوم ہے کہ آپ نے سات سال کی عمر میں قرآن کریم حفظ کرلیا تھا اور مزید تحصیل علم کے لیے حجاز مقدس کا سفر کیا تھا، آپ نے حرمین شریفین میں تیرہ سال قیام فرمایا، چوں کہ ذوق علمی تھا اس لیے وہاں سے قلمی کتابوں کا ایک بڑا ذخیرہ ہم راہ لائے، آپ کے سلسلہ ارشاد و بیعت میں بہت سے ارباب علم تھے جن کے پاس کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا، ان لوگوں نے بھی آپ کے کتب خانہ کے لیے بہت سی کتابیں نذر کیں، اسی طرح حضرت پیر محمد شاہ لائبریری کی ابتدا ہوئی، پھر تو فتوحات غیبی کی طرح آپ کے کتب خانہ میں کتابوں کی بارش ہونے لگی، اس طرح یہ کتب خانہ ۱۳۲۵ھ میں حضرت پیر محمد شاہ کی زندگی ہی میں قائم ہوگیا تھا، جن بزرگوں نے اس کتب خانہ کو مرکزی حیثیت دینے میں حصہ لیا، ان میں مندرجہ ذیل حضرات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں:

۱- مولانا عمادالدین ابن ولی اللہ گجراتی جو ایک زبردست عالم حدیث اور کتابوں کے ایک بڑے ذخیرہ کے مالک تھے، انہوں نے تقریباً بارہ سو مخطوطات کا علمی ذخیرہ اس کتب خانہ کو منتقل کیا۔

۲- کڑی (ضلع مہسانہ) میں آپ کے مریدوں کی ایک بڑی تعداد تھی، انہوں نے حسب توفیق بہت سی کتابیں نذر کیں۔

۳- احمد آباد شہر میں سنی بوہروں کی ایک کثیر تعداد بستی ہے، ان لوگوں کو شاہ صاحب سے بڑی عقیدت تھی، ان تمام حضرات نے اپنے تمام ذخائر کتب اس کتب حانہ کو پیش کردیے، اس کا فائدہ نہ صرف اس لائبریری کو ہوا بلکہ ان منتشر کتابوں کی تحفیظ بھی ہوگئی۔

۴- احمد آباد میں ایک صاحب علم خاندان پروفیسر محبوب حسین عباسی کا ہے، انہوں نے بھی اپنا چار سو مخطوطات کا اثاثہ بہ خیال استفاضۂ عمومی و تحفیظ کتب اس لائبریری کے حوالہ کیا۔

۵- مولوی محمد خوب پٹی والے خلیفہ پیر جماعت علی شاہ نے بھی اپنی کتابیں اس لائبریری کی نذر کردیں۔

اس لائبریری کی مندرجہ ذیل خصوصیات اہالیان علم کے لیے لائق توجہ ہیں:

۱- قرآنیات وعلوم الحدیث، فقہ وتصوف اور دیگر علوم دینیہ نیز علم وحکمت کے تقریباً چار ہزار مخطوطات جو دسویں صدی ہجری سے قبل کے ہیں، یہاں تمام وکمال محفوظ ہیں۔

۲- بزرگوں کے ملفوظات کا بہت بڑا قلمی ذخیرہ ہے جس پر ریسرچ اور ان کے editing کی ضرورت ہے۔

۳- قدیم فارسی کے دواوین ہیں، ان پر فارسی میں ریسرچ کرنے والوں کی توجہ درکار ہے۔

۴- اس لائبریری میں میر امن کی ''باغ وبہار'' کا پہلا ایڈیشن موجود ہے جو مطبع کے ایجاد کے بعد کا ایک تاریخی نسخہ ہے۔

۵- لائبریری میں بے شمار نوادرات ہیں جن کی تاریخی حیثیت ہے، یہ نوادرات ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی مرحوم کے حسن توجہ کی مرہون منت ہیں۔

۶- قدیم فہارس کتب مع تراجم مصنفین وعناوین کتاب جیسے ''الفہرست'' (ابن الندیم)، ''ابجد العلوم'' (نواب صدیق حسن خاں)، ''کشف الظنون'' (حاجی خلیفہ)، ''مفتاح کنوز السعادۃ'' (تاش کبری زادہ) اور ''کشاف ومصطلحات الفنون'' (تھانوی) جیسی امہات کتب بھی یہاں موجود ہیں۔

۷- ''معجم المفہرس لالفاظ القرآن'' (فواد عبدالباقی)، ''معجم المفہرس لالفاظ الحدیث'' (فنسک) اور ''مفتاح کنوز السنۃ'' (فواد عبدالباقی) جیسی اہم لغات لوگوں کی سہولت کے لیے دست یاب ہیں۔

۸- عربی وفارسی نیز اردو کی تمام مطبوع وغیر مطبوع تفاسیر اور جملہ کتب احادیث اور ان کی تمام شروح کا خزانہ بھی یہ لائبریری ہے۔

۹- اساطین کتب معتبرہ جو عام لائبریریوں میں نہیں پائے جاتے یہاں موجود ہیں، اقران مختلف کے اعیان پر جتنی کتابیں مطبوع ہو چکی ہیں آپ کو یہاں ملیں گی۔

۱۰- عربی زبان اور مفردات کی تمام لغات معتبرہ نیز فارسی اور اردو کی تمام لغات بھی یہاں موجود ہیں۔

۱۱- دنیا میں جتنی بھی بڑی لائبریریاں ہیں، ان کی فہارس کتب (catalogues) محققین کی سہولت کے لیے یہاں دست یاب ہیں، جیسے: Ethe, Boudline پاکستان نیشنل لائبریری، کتب خانہ انجمن ترقی اردو پاکستان، شیرانی کلکشن پاکستان، خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ، گورنمنٹ رضا لائبریری رام پور، کتب خانہ آصفیہ (گورنمنٹ نیشنل لائبریری) حیدرآباد، ہمدرد لائبریری نئی دہلی، کتب خانہ ندوۃ العلما لکھنؤ، ٹونک لائبریری، سیتا مئو لائبریری۔

ہوسکتا ہے اور لائبریریوں کی فہارس بھی موجود ہوں جن کا علم مضمون نگار کو نہیں ہوسکا، مخطوطات کی دو مزید اہم لائبریریاں جن کی فہرست کی موجودگی محققین کی سہولت کی موجب ہوسکتی تھی، یہ ہیں: ۱- کتب خانہ محمدیہ، جامع مسجد ممبئی، ۲- یو-پی اسٹیٹ آرکائیوز نیز پبلک لائبریری الہ آباد۔

اس وقت لائبریری میں زائد از دس ہزار مخطوطات کے علاوہ بیس ہزار کی تعداد میں قدیم مخطوطات ہیں جن میں انگریزی کی ایک ہزار اور گجراتی زبان کی دو ہزار مطبوعات ہیں، اردو، انگریزی نیز دیگر زبانوں کی مطبوعات کی آمد کا سلسلہ جاری ہے، مجموعی طور سے اس وقت کتب خانہ میں چالیس ہزار سے زیادہ کتابیں موجود ہیں۔

اس لائبریری کو موجودہ شکل دینے میں جن لوگوں نے حصہ لیا ہے ان میں مولانا ابوظفر ندوی کا نام سر فہرست ہے، ملازمت سے قبل از وقت رٹائرمنٹ لے لینے کے بعد انہوں نے اپنا سارا وقت لائبریری کی تزئین وترتیب میں صرف کیا، کئی قلمی مخطوطات کی تصحیح وترتیب کی، ان میں ''مرأۃ احمدی'' کا ترجمہ اور ''تذکرۂ اقدس'' جیسی محققانہ تصنیف بھی شامل ہے جو حضرت شاہ پیر محمد کی سوانح حیات ہے۔

مولانا ابوظفر ندوی کے علاوہ جن لوگوں نے اسے ایک جدید لائبریری کی شکل دینے میں حصہ لیا، ان میں ایک جناب غلام نبی صاحب ہیں لیکن ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی مرحوم کا نام سب سے اہم اس لیے ہے کہ لائبریری کی موجودہ cataloguing کی صورت انہیں کی دی ہوئی ہے، ڈیسائی صاحب کے علاوہ جناب اے۔ این قریشی اور اکبر علی صاحبان نے اس کی ترتیب وتزئین میں حصہ لیا ہے، ۱۹۹۱ء سے اس کے ڈائرکٹر جناب پروفیسر ڈاکٹر محی الدین بمبئی والا ہیں، جنہیں ان

کی فارسی زبان کے تئیں ادبی و تحقیقی خدمات کے اعتراف میں صدارتی ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔

اس وقت لائبریری سے فائدہ اٹھانے والے ممبران کی تعداد چار سو ہے، ریڈنگ روم میں گجراتی زبان کے پانچ روزنامے، انگریزی کے دو روزنامے اور اردو زبان کا ایک روزنامہ اخبار آتا ہے، اردو کا ہفت روزہ ''نئی دنیا'' بھی یہاں مل جاتا ہے، جہاں تک رسالوں کا تعلق ہے اردو زبان کے تقریباً تمام ہی ادبی، علمی، تحقیقی اور مذہبی رسالے آتے ہیں لیکن اردو پڑھنے والوں کی تعداد نفی کے برابر ہے، گجراتی زبان کے مذہبی رسالے ''الاصلاح''، ''تبلیغ'' اور ''امید'' ہیں۔

پروفیسر محی الدین بمبئی والا فارسی کے ممتاز عالم اور محقق ہیں، آپ کی کارگزاریوں کا دائرہ بہت وسیع ہے، علمی اور تعلیمی کے علاوہ اصلاح معاشرہ، امداد غربا اور تعاون فی الخیر کے کاموں میں آپ ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں لیکن آپ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ احمد آباد کی تمام علمی شخصیتوں کو آپ نے ایک لڑی میں پرو رکھا ہے، اسی کا نتیجہ ہے گجرات اردو ساہتیہ اکیڈمی اور حضرت پیر محمد شاہ لائبریری کی علمی سرگرمیاں توام ہوگئی ہیں، احمد آباد میں گجرات اردو ساہتیہ اکیڈمی وقتاً فوقتاً علمی سیمینار منعقد کرتی رہتی ہے اور ایسے ہی سیمینار حضرت پیر محمد شاہ لائبریری کے زیر انتظام بھی ہوتے ہیں، دونوں جگہ احمد آباد کے وہی اہل علم حضرات پیش پیش رہتے ہیں، اس وجہ سے ان دونوں اداروں کی سرگرمیوں میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے، چوں کہ لائبریری کا اپنا کانفرنس ہال ہے، اس لیے بعض اوقات اکیڈمی کی کانفرنسیں یہاں بھی ہوتی ہیں، ان کانفرنسوں میں جو علمی مقالات پڑھے جاتے ہیں، انہیں نظامت کانفرنس کی طرف سے شائع کر دیا جاتا ہے، اکیڈمی کا آرگن ''سابرنامہ'' اور لائبریری کا آرگن ''علمی و ثقافتی جرنل'' ہے، مقام مسرت ہے کہ راقم الحروف کو دونوں آرگن کے جتنے شمارے دیکھنے کو ملے ہیں سبھوں میں صرف علمی و تحقیقی مقالے ہیں، یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہے جو گجرات جیسے علاقہ میں جہاں مسلمانوں کی تعداد صرف پانچ فیصد، گھروں میں اردو بولنے والوں کی تعداد ایک فیصد اور حکومت مسلمان دشمن ہے، انجام پا رہا ہے، گجرات ہندوستان کا واحد صوبہ ہے جہاں کی اردو ساہتیہ اکیڈمی نے اپنے یہاں کے شعرا و ادبا کی مالی اعانت تو کی ہے لیکن اس کا اصل کام اہم فارسی و عربی مخطوطات کی تحقیق، ان کے ترجمے اور ان پر تعلیقات شائع کرنا ہے، اس ذیل میں پروفیسر بمبئی والا کے ساتھ پروفیسر نثار احمد انصاری اور پروفیسر محبوب حسین عباسی کا نام لینا ضروری

ہے، مشہور نقاد پروفیسر وارث علوی جو ولی گجراتی اور شاہ وجیہ الدین علوی کی علمی و ادبی شناخت کے وارث ہیں، اس وقت اکیڈمی کے صدر اور سرپرست کی حیثیت رکھتے ہیں، اکیڈمی اور لائبریری کا کام اتنا گتھا ہوا ہے کہ ادبی سرگرمیوں میں ان کی کاوشوں کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا، اس کے دو اسباب ہیں، ایک تو یہ کہ دونوں کے کرتا دھرتا تقریباً ایک ہی ہیں، دوسرے یہ کہ چوں کہ گجرات اردو ساہتیہ اکیڈمی کا صدر دفتر اولڈ اسمبلی بھون گاندھی نگر میں ہے جو شہر سے سولہ کلومیٹر کے فاصلہ پر ہے، اس لیے شہر سے اتنی دور نہ جاتے ہوئے اکیڈمی کی اسسٹنٹ رجسٹرار جو ایک خاتون ہیں حضرت پیر محمد شاہ لائبریری ہی میں بیٹھ کر اکیڈمی کے کام نبٹاتی ہیں، راقم الحروف کو یہ لکھنے میں کوئی تکلف نہیں ہے کہ حکومتوں کی قائم کردہ اردو اکیڈمیوں میں گجرات اردو ساہتیہ اکیڈمی واحد اکیڈمی ہے جو علمی کتابوں کی تحقیق و تعلیق اور ان کی اشاعت کا کام کر رہی ہے، اس کا ثواب (credit) پیر محمد شاہ لائبریری کے ڈائرکٹر جناب پروفیسر محی الدین بمبئی والا اور ان کے رفقا کو جاتا ہے، اکیڈمی اور لائبریری نے اب تک جو کتابیں شائع کی ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

۱- اکیڈمی کا صحیفہ ''سابرنامہ'' جس کا آٹھواں شمارہ ۲۰۰۵ء میں شائع ہوا ہے جو مقالات اور شعریات کا مجموعہ ہے۔

۲- لائبریری کا صحیفہ ''گجرات کی علمی، ادبی اور ثقافتی وراثت'' کا جرنل نمبر۴، ۲۰۰۷ء میں شائع ہوا ہے، جس میں فارسی زبان کے ایک تین روزہ سیمینار میں پیش کردہ مقالے جمع کیے گئے ہیں۔

۳- ولی گجراتی از قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی (۲۰۰۴ء)، اس کتاب میں ولی پر قاضی صاحب مرحوم کے تحقیقی مضامین ہیں۔

۴- کارنامۂ ولی گجراتی (۲۰۰۶ء)، ولی گجراتی پر منعقدہ ایک سیمینار کے مقالات کا مجموعہ۔

۵- کلام اشرف اور چند گجری شعرا و مدحیہ قصائد (۲۰۰۷ء)، ولی کے شاگرد اشرف اور دیگر چند شعرا کے قلمی کلام کا ایک ضخیم مجموعہ۔

۶- مرأۃ سکندری (۱۹۹۵ء)، صوبہ گجرات کی ضخیم فارسی تاریخ کا اردو ترجمہ از مرحوم پروفیسر مرتاض حسین قریشی۔

۷- النور السافر عن اخبار القرن العاشر (۲۰۰۱ء)، دسویں صدی ہجری کے ایک گجراتی

مصنف کی عربی میں لکھی گئی اعیان اسلامی کی تاریخ کا اردو ترجمہ از پروفیسر محمد عارف الدین فاروقی۔

۸- مکالمات ابوالکلام (بار دیگر) (۲۰۰۲ء)۔

۹- مرقاۃ الوصول (ملفوظات حضرت شیخ گنج بخش مغربی) (۲۰۰۴ء)، پروفیسر نثار احمد انصاری کا پی-ایچ-ڈی کے لیے تیار کردہ مقالہ بہ زبان انگریزی مع تصحیح شدہ متن۔ (یہ مقالہ کتاب بھون نے شائع کیا ہے لیکن اس کا مخطوطہ لائبریری کا ہے)

۱۰- تاریخ اولیائے گجرات ترجمہ مرآۃ احمدی از مولوی ابوظفر ندوی (۲۰۰۱ء)۔

۱۱- تذکرۃ اقدس، تذکرہ حضرت پیر محمد شاہ (جن کے نام سے لائبریری قائم ہے) از مولوی ابوظفر ندوی، اشاعت ثانی ۲۰۰۵ء۔

۱۲- تاریخ گجرات (بار دیگر) از رکن الدین ولی بہ زبان فارسی کا اردو ترجمہ مع مقدمہ از ڈاکٹر شبیہ احمد مرحوم (الہ آباد یونی ورسٹی)۔

۱۳- منتخبات رباعیات رضا از پروفیسر نثار احمد انصاری، ۱۹۹۹ء، بی-اے کے طلبہ کے لیے فارسی نظموں کا ایک انتخاب۔

یہ ساری کتابیں پروفیسر بمبئی والا کے دور سربراہی میں شائع ہوئی ہیں۔

حضرت پیر محمد شاہ لائبریری، درگاہ حضرت پیر محمد شاہ کے حدود میں واقع ہے اور مشرقی داخلی دروازہ کے اوپر ہے، ذیلی منزل میں کانفرنس ہال ہے، پہلی منزل پر دفاتر ہیں اور دوسری منزل پر لائبریری ہے، درگاہ سے متصل ایک عظیم الشان مسجد ہے جو اسلامی طرز تعمیر کا نمونہ ہے، درگاہ کے جنوبی دروازہ سے متصل ایک اور چھوٹی مسجد ہے جو اب حسب ضرورت خواتین کی نماز کے لیے استعمال ہوتی ہے، مسجد کے شمالی حصہ میں مہمان خانہ اور منتظمین نیز خادمین کے لیے رہائشی کمرے ہیں، اس کے بعد تالب سڑک درگاہ کی جائداد مکانوں اور دوکانوں کی شکل میں ہے، جس کے کرایہ نے اس عظیم کتب خانہ کو کسی بیرونی امداد واعانت سے مستغنی کردیا ہے، جانب مشرق بھی دوکانیں ہیں، محلہ چوں کہ مسلمانوں کا ہے اس لیے فجر کے علاوہ دیگر اوقات میں مسجد کی کئی صفیں مصلیوں سے پر رہتی ہیں، جمعہ کے دن پوری مسجد بھر جاتی ہے۔

لائبریری میں انتظامیہ کے دفاتر کے علاوہ مخطوطات کا ایک صیغہ ہے، جس کی خصوصیت

سے نگہداشت کی جاتی ہے، ریڈنگ روم میں ارباب ذوق وتحقیق کے لیے تمام سہولتیں میسر ہیں، سمینار یا تحقیق کی غرض سے باہر کے مہمانوں کو لائبریری اپنا مہمان تصور کرتی ہے اور وہاں پہنچ کر آدمی گھر کا سارا آرام محسوس کرتا ہے، مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم ناظم دارالمصنفین و اڈیٹر "معارف" (اعظم گڈھ) جب بھی احمد آباد تشریف لاتے تھے، یہیں قیام فرماتے تھے، ڈاکٹر عبدالحق صاحب سابق صدر شعبہ اردو دہلی یونی ورسٹی آج بھی یہیں قیام فرماتے ہیں، مہمانوں کی سہولت کے لیے پروفیسر بمبئی والا کے مزید پلان بھی ہیں جو عنقریب حیطۂ عمل میں آنے والے ہیں۔

لیکن افسوس کہ یہ عظیم الشان لائبریری علم کے قدردانوں کی توجہ سے محروم ہے، احمد آباد کی پچاس لاکھ آبادی میں مسلمان کم از کم دو لاکھ ضرور ہوں گے لیکن اس عظیم شہر (metropolis) میں سوائے درگاہ شریف کی لائبریری کے ایک بھی بورڈ اردو کا نظر نہیں آتا، یہاں تک کہ ہوٹلوں اور مسجدوں میں بھی یہاں اردو ناپید ہے، رسم الخط کے معاملہ میں اردو والوں کی یہ بے اعتنائی صوبہ میں اردو کے مستقبل پر ایک سوالیہ نشان ہے، لائبریری اہالیان علم اور شائقین کی نگاہ توجہ کی منتظر ہے، گجرات ودیا پیٹھ احمد آباد میں اردو اور فارسی اور مہاراجہ گائکواڑ یونی ورسٹی بڑودہ میں اردو اور فارسی اور عربی کے شعبے قائم ہیں لیکن دوسری جگہوں کی طرح یہاں بھی یہ شعبے لوگوں کی بے توجہی کا شکار ہیں، مقام مسرت ہے کہ پروفیسر نثار احمد انصاری صاحب نے گجرات ودیا پیٹھ میں اب چند لڑکیوں کو جن میں کچھ غیر مسلم بھی ہیں اردو کی طرف رغبت دلائی ہے اور ان کی ہمت افزائی کی خاطر انہیں ۲۴-۲۵ر فروری ۲۰۰۸ء کو منعقدہ نیشنل حالی سمینار میں بولنے کا موقع دیا ہے، اس سے یقیناً ان بچیوں کی حوصلہ افزائی ہوگی، گجرات کی مذکورہ دونوں یونی ورسٹیوں میں ریسرچ کرنے والوں کو اس قیمتی ذخیرہ سے استفادہ کرنا چاہیے، ملک کے تمام ارباب علم وتحقیق کو دوسری بڑی لائبریریوں کی طرح اس لائبریری کی بھی علمی سرپرستی کرنی چاہیے ورنہ اندیشہ ہے کہ اس لائبریری کی نگہداشت کرنے والوں کے حوصلے پست ہوجائیں گے، اس سلسلہ میں ملک کے الگ الگ علاقوں سے تعلیمی وفود کی آمد بھی سود مند اور یہاں والوں کے عزائم کو بلند رکھنے میں معاون ہوگی، امید ہے کہ لائبریری میں ان کا استقبال ہوگا اور اچھی میزبانی ہوگی۔

اس عظیم لائبریری کے دروازے اہالیان علم کی نگاہ توجہ کے منتظر ہیں۔

نعیم صدیقی......ایک منفرد سیرت نگار

عبداللہ شاہ ہاشمی

خالق کائنات نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا، اسے فرشتوں پر فضیلت دی اور اسے بہت سی نعمتوں سے نوازا، ان تمام نعمتوں میں سے کسی انسان کے لیے سب سے بڑی نعمت اسلام کی دولت ہے، یہ نعمت انسان کو اللہ کے کلام اور انبیا و رسل کے ذریعے نصیب ہوئی، یہ مرسلین مختلف قوموں اور علاقوں کے باشندوں کی رشد و ہدایت کے لیے آئے یہاں تک کہ نبی کریمؐ کو قیامت تک آنے والی نسلوں کے لیے مبعوث فرمایا اور چوں کہ نبیؐ کی ذات قرآن کی علمی تفسیر بھی ہے، اس لیے سیرت کی اہمیت دوچند ہوجاتی ہے اور یہی سیرت نگاری کا جواز ہے اور یہی وجہ ہے کہ پوری اسلامی تاریخ میں سیرت نگاری ایک اہم ترین موضوع رہا ہے۔

سیرت نگاری کا سلسلہ نبی آخر الزماں کے حین حیات شروع ہوا اور اب تک سیرت پر ہزاروں کتب لکھی جاچکی ہیں، اہل عرب کو کتب تواریخ، کتب اسماء الرجال، کتب آثار واخبار اور تفاسیر قرآن جیسے بنیادی ماخذ میسر تھے اور تدوین حدیث کے لیے روایت و درایت کے کڑے معیارات بھی موجود تھے، اس لیے سیرت نگاری کو ٹھوس بنیادیں میسر آئیں اور اسی لیے عربی زبان میں لکھی جانے والی کتب سیر خصوصاً محمد ابن اسحاق، ابن ہشام اور ابن سعد کی تصانیف تحقیقی نقطہ نظر سے اپنی مثال آپ ہیں، مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کا قیامت تک کوئی حریف نہیں ہوسکتا کہ انہوں نے پیغمبرؐ کے حالات و واقعات کا ایک ایک حرف اس استقصا کے ساتھ محفوظ رکھا کہ کسی شخص کے حالات آج تک اس جامعیت اور احتیاط کے ساتھ قلم بند نہیں ہوسکے

لاہور۔

اور نہ آیندہ توقع کی جاسکتی ہے"۔[1]

اردو میں سیرت نگاری کی ابتدا گیارہویں صدی ہجری میں نورناموں، مولود ناموں اور معراج ناموں سے ہوئی اور تیرہویں صدی ہجری میں جنوبی ہند میں نثری نورنامے بھی لکھے جانے لگے لیکن بیسویں صدی عیسوی کا دور اس لحاظ سے نہایت ثروت خیز رہا کہ اس میں "رحمت للعالمین"، "سیرت النبی"، "سیرت رسولؐ"، "اصح السیر" اور "النبی الخاتم" جیسی پایے کی کتب شائع ہوئیں، چند دیگر معیاری کتب کے علاوہ کچھ غیر مسلموں نے بھی سیرت رسول پر کتابیں لکھیں جنہیں مسلمان اکابرین نے سراہا۔

مولانا شبلی اور سید سلیمان ندوی نے سیرت نگاری میں واقعہ نگاری سے آگے بڑھ کر کام کرنے پر زور دیا، چنانچہ خود انہوں نے "سیرت النبی" میں علم کلام سے کام لیا اور انہوں نے سیرت نگاری میں انشاپردازی کے خوب صورت نمونے پیش کیے، اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ نئے لکھنے والوں کو حوصلہ ملا اور انہوں نے سیرت نگاری کے لیے وسیع ترکینوس کا انتخاب کیا، بیسویں صدی کے چھٹے عشرے کے اواخر میں نعیم صدیقی کی "محسن انسانیت" شائع ہوئی، اس میں مولف نے تحریکی شعور کے تحت سیرت کے انقلابی پہلو کو اجاگر کیا اور زوردار اور موثر اسلوب اپنایا جس کی وجہ سے اسے توقع سے بڑھ کر پذیرائی ملی۔

نعیم صدیقی ایک پُرگو شاعر اور صاحب طرز ادیب تھے، ان کے سات شعری مجموعے شائع ہوئے اور کئی ایک تو بار بار شائع ہوئے، ان کے نثری سرمائے میں تین درجن کتب اور سیکڑوں مضامین و مقالات شامل ہیں لیکن یہ اتفاق بڑا حسین ہے کہ شاعری میں ان کا نعتیہ مجموعہ "نور کی ندیاں رواں" پاکستان اور بھارت میں بار بار چھپا اور نثر میں "محسن انسانیت" کو اتنی مقبولیت نصیب ہوئی کہ پاکستان اور بھارت میں اس کے پچاس کے لگ بھگ ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں، اس کا ملخص انگریزی میں شائع ہوچکا لیکن نصف صدی گزرنے کے باوجود اس کی طلب میں کمی نہیں آئی اور پاکستان اور بھارت میں ہر سال اس کے ایڈیشن شائع ہوتے ہیں۔

نعیم صدیقی کو اللہ تعالیٰ نے حب نبیؐ سے نوازا اور انہوں نے سیرت کے موضوع پر تسلسل سے لکھا، سیرت پر ان کا نثری سرمایہ "محسن انسانیت" کے علاوہ "سید انسانیت"، "رسول اور سنت رسول"،

"رسول اللہ بہ حیثیت معلم"، "رہبر انسانیت" اور خطبہ حجۃ الوداع" جیسی تصانیف کے علاوہ دو درجن سے زائد مضامین و مقالات پر مشتمل ہے لیکن بنیادی اور اہم تالیف "محسن انسانیت" ہی ہے۔

نعیم صدیقی کے ہاں سیرت نگاری کا بنیادی محرک تو ذات نبویؐ سے عشق و محبت کا جذبہ صادق ہے کیوں کہ اس کے بغیر تحریر اس تاثیر سے خالی رہتی ہے جو دلوں کو مسخر کرتی اور صحیح فہم پیدا کر کے قارئین کے حلقے میں اپنا مقام بناتی ہے، ان کے ہاں دوسرا محرک یہ تحریکی شعور ہے کہ سیرت کے ذریعے اس مقصد کو اجاگر کیا جائے جو خود نبی کریمؐ کے پیش نظر تھا، یعنی پورے تمدنی شعور کے ساتھ انسانی زندگی کی کامل تبدیلی، نعیم صدیقی اس کی وضاحت کرتے ہیں:

"حضور ﷺ کے پیش نظر جہاں اعتقادی اور اخلاقی انقلاب تھا، وہاں پوری اہمیت کے ساتھ سیاسی انقلاب بھی تھا، جہاں فرد کی اصلاح مقصود تھی وہاں تمدن کی درستی بھی مقصود تھی، دوسرے لفظوں میں حضور ﷺ نے انسان کو ایک اجتماعی وجود کی حیثیت سے سامنے رکھا"۔ ۲

مولف نعیم صدیقی نے سیرت نگار کی حیثیت سے واقعات کے انتخاب، ترتیب اور اسلوب بیان میں بڑی سلیقہ مندی کا ثبوت دیا اور یہ خوبیاں ان کی کامیاب سیرت نگار ہونے کی دلیل ہیں،، جناب ماہر القادری نے اس کی تحسین کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ "نعیم صدیقی کے ادب و انشا، اسلوب نگارش، انداز فکر، دینی رجحان، مورخانہ بصیرت اور ذوق انتخاب کا نہایت حسین تعارف ہے"۔ ۳

"محسن انسانیت" کے مولف نے سیرت رسول کی واقعاتی ترتیب کو پیش نظر رکھا اور ان واقعات کے منطقی انجام پر بھی نظر رکھی، ان کا اصرار ہے سیرت کا یہی پہلو سب سے زیادہ قابل غور ہے، دراصل ساری جدوجہد اور مصائب کا سامنا ایک بڑے انقلاب کے لیے تھا، واقعات کی منطقی ترتیب اور نتائج پر ایک نظر ڈالنے سے مولف کے پیش کردہ تاریخی شواہد ٹھوس اور دلائل وزنی معلوم ہوتے ہیں۔

مکہ کے معزز خاندان کے امین و صادق فرد نے نبوت پر سرفراز کیے جانے کے بعد معاشرے کی ہدایات کے مطابق بدلنے کا عندیہ دیا تو انہیں بڑے کٹھن اور تکلیف دہ حالات کا

سامنا کرنا پڑا، مکہ کے بازاروں میں ان پر گندگی پھینکی گئی، ذہنی و جسمانی اذیتیں دی گئیں، طائف میں لہولہان کیا گیا اور جاں نثار انقلابی ساتھیوں سمیت ہجرت کے دکھ سہنا پڑے، مدینہ کی اسلامی ریاست قائم ہوئی تو اسے ناقابل برداشت سمجھ کر جنگی حالات سے دوچار کیا گیا، غزوات ہوئے، مختلف قبائل کے معاملات اور معاہدات ہوئے اور اسلامی ریاست کی حدود دس لاکھ مربع میل تک پھیل گئیں، ایک نیا معاشرہ وجود میں آیا جو مکہ کے معاشرے سے یکسر مختلف اور انسانی نفسیات کے زیادہ قریب تھا، اس تمام تر تناظر میں نبی کریم ﷺ کا کردار (سیرت) ملاحظہ فرمائیے، انہوں نے ایک قائد کی حیثیت سے پوری بصیرت کے ساتھ تاریخ کے دھارے پر نظر رکھی اور پورے سیاسی شعور کے ساتھ امور مملکت پر غور و فکر کرتے ہوئے قائدانہ کردار ادا کیا، آج بھی سیرت لکھنے اور اس سے استفادے کا انداز یہی ہونا چاہیے کہ حضور کی سیرت و کردار کی روشنی میں فرد اپنے آپ کو اندر سے بدلے (لیکن یہاں تک محدود نہ رہے) اور افراد اور معاشرہ ان ہی راہوں پر چل کر اجتماعی زندگی میں وہی انقلاب برپا کریں جو حضورؐ نے عملاً برپا کیا، نعیم صدیقی کے سامنے سیرت صرف ایک مسلم فرد یا معاشرے تک محدود نہیں، لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک سیرت کے مطالعے کا ایک ہی مقصود ہے، حضورؐ کے پیغام کی مشعل ہمارے سامنے اور پوری انسانیت کے سامنے ایک بار پھر نور پاش ہو اور قافلۂ زندگی دور حاضر کی تاریکیوں میں اس طرح جادۂ فلاح کا سراغ پالے جس طرح اسے ساتویں صدی عیسوی میں بحران سے نجات کا راستہ ملا تھا"۔ ۴

اکیسویں صدی میں انسانیت جس روحانی افلاس اور اخلاقی پس ماندگی سے دوچار ہے اس کا منطقی تقاضا ہے کہ سیرت کی کامل صداقتوں کو نوع انسانیت کے سامنے لایا جائے، انسانیت کو آج بھی کسی انسان کامل کی تلاش ہے، بے شک نبی کریم ﷺ کی ذات سے عقیدت و محبت ایک مسلمان کے لیے سرمایۂ قلب و نظر ہے لیکن آپؐ کے پیغام کا یہ تقاضا بھی ہے کہ اسے پوری کاملیت اور جامعیت کے ساتھ پوری نوع انسان کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے، تاکہ وہ فلاح کے منہاج تک پہنچ کر اسوۂ کامل کا اتباع کر کے شفاعت کی حق دار ہو، نعیم صدیقی کا نقطۂ نظر یہی ہے کہ اس کامل و اجمل سیرت کے اس پہلو کو نظر انداز نہ کیا جائے جو قوت کے بل پر سب سے زیادہ

اثر انداز ہوتا ہے۔

ایک آفاقی تہذیب کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے، خصوصاً قرآن کے اہل ایمان کے علاوہ پوری نوع انسان کو خطاب کے بعد اس میں ذرا برابر شبہ باقی نہیں رہتا کہ سیرت رسولؐ پوری انسانی تہذیب کے لیے اہمیت کی حامل ہے، خاتم المرسلین ﷺ کی نبوت سے پہلے دیگر مرسلین کی نبوت اور رسالت کا دائرہ کسی نہ کسی خاص قوم یا زمین کے خاص علاقے اور خطے تک محدود رہا اور ان کے مخاطب بھی وہی لوگ یا علاقائی آبادی رہی لیکن جب خاتم الانبیا کی نبوت کا دائرہ قیامت تک پوری بنی نوع انسان تک بڑھا دیا گیا تو پھر اتنی بڑی تعداد کے لیے زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں رہنا چاہیے جہاں رہنمائی کا سامان موجود نہ ہو، نعیم صدیقی سیرت نگاری کے اسی پہلو کو نمایاں اور اجاگر کرنا چاہتے ہیں کہ انسان کی اجتماعی زندگی پر پوری دنیا میں سیاست سب سے زیادہ اثر انداز ہوتی ہے اور بناؤ اور بگاڑ کا سب سے موثر عنصر یہی ہے تو اس سے صرف نظر کیوں کیا جائے، سیرت پاک ہمیں بتاتی ہے کہ حضورؐ نے کس طرح مدینہ کے مختلف سماجی عناصر اور قبائل سے دستوری معاہدے اور حلیفانہ تعلقات قائم کیے، تجارتی شاہ راہوں کی ناکہ بندی، غزوات میں جنگی حکمت عملی، شورشوں اور فتنوں کا تدارک اور یہ سب کچھ جس حکمت و بصیرت سے کیا اس سے آج بھی رہنما اصول اخذ کیے جا سکتے ہیں، نعیم صدیقی مزید کہتے ہیں کہ:

"حضور ﷺ کے کارنامے کا سیاسی پہلو اتنا اوجھل رہ گیا ہے کہ آج حضورؐ کی دعوت اور نصب العین کا صحیح تصور باندھنا مشکل ہوگیا ہے، حضورؐ پورا دین لائے تھے، حق کی بنیادوں پر ساری زندگی کا نظام قائم کرنے آئے تھے، جس طرح کسی اور پہلو میں حضورؐ کا کوئی ہم سر نہیں ہو سکتا اسی طرح سیاسی قیادت کی شان میں بھی آپ کا کوئی ہم سر نہیں ہے، جس طرح آپؐ زندگی کے ہر معاملے میں اسوہ و نمونہ ہیں، اسی طرح سیاسی جد وجہد کے لیے بھی آپؐ کی ذات ہمیشہ کے لیے اسوہ و نمونہ ہے"۔ ۵

نعیم صدیقی سیرت کے مطالعے کا مقصود یہ بتاتے ہیں کہ حضورؐ کی پیروی زندگی کے تمام معاملات میں ہمہ پہلو ضروری ہے، چند سنتوں کو اپنا کر دنیاداری میں غیروں کے قانون پر راضی

رہنا ایک تضاد ہے بلکہ منافقت ہے، انہوں نے بڑے مدلل انداز میں حضورؐ کو ایک قائد انقلاب کے روپ میں پیش کیا، آپؐ نے حق کا پیغام پہنچایا جن لوگوں نے ساتھ دیا انہیں منظم کیا اور تحریک اسلامی کے ان کارکنوں کو انقلاب کا شعور دیا، ہجرت کی، ایک ریاست قائم کی اور خدا کے دیے ہوئے قوانین کے مطابق امور مملکت طے کیے، یہ سب کچھ کیا ہے اس سے پہلوتہی کیوں؟ پھر یہ پہلو بھی قابل غور ہے کہ اس انقلاب، کارنامے کا ایک پہلو بھی لائق توجہ ہے:

"حضورؐ کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ آپ کی دعوت نے پورے کے پورے انسان کو اندر سے بدل دیا، صبغۃ اللہ کا ایک ہی رنگ مسجد سے لے کر بازار تک، مدرسہ سے عدالت تک اور گھروں سے لے کر میدان جنگ تک چھا گیا، ذہن بدل گئے، رسوم و رواج بدل گئے، خیر و شر کے پیمانے بدل گئے، معیشت اور ازدواج کے اطوار بدل گئے اور تمدن کے ایک ایک ادارے اور ایک ایک شعبے کی کایا پلٹ گئی"۔ ۶

یہ سب کچھ ایک مختصر عرصے میں ہوا کہ انسان کو اندر سے بدل دیا گیا، ایسے انقلاب کے لیے ایک انسان کی زندگی کافی نہیں ہوتی مگر یہ حیرت انگیز کارنامہ سیرت کا نمایاں پہلو ہے، ڈاکٹر اسرار احمد کہتے ہیں:

"محمد رسول اللہ ﷺ کا انقلاب اس اعتبار سے منفرد اور لاثانی ہے کہ ایک انسانی زندگی کے اندر کل تئیس سال کے عرصے میں الف سے ی تک انقلاب کے تمام مراحل طے ہو گئے، دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ حضورؐ کی سیرت ایک فرد کی سیرت نہیں بلکہ ایک تاریخی قوت کی داستان ہے جو ایک انسانی پیکر میں جلوہ گر ہوئی...... یہ محض ایک انسان کی نہیں ایک انسان ساز کی روداد ہے"۔ ۷

لطف الرحمان فاروقی نے سورۂ بنی اسرائیل میں محفوظ اس چودہ نکاتی خاکے کا ذکر کیا ہے جس میں ہجرت کے بعد اسلامی اصولوں پر مبنی معاشرے اور ریاست کا قیام عمل میں آنا تھا، سورۂ انعام کی آیات میں بھی اسلامی معاشرے اور ریاست کی فکری، اخلاقی، تمدنی، معاشی اور قانونی بنیادوں کا نشان دہی کرتی ہیں۔ ۸

نعیم صدیقی کی سیرت نگاری میں انقلابی پہلو کے ساتھ ہی انہوں نے معرکۂ حق وباطل اور خیر وشر کی کشمکش میں حضورؐ کی استقامت کو نمایاں کیا:

"جی میں آئی کہ آنحضور ﷺ کی سیرت کے اس پہلو کو اجمالاً نمایاں کیا جائے کہ آپؐ نے اپنی قوم اور انسانیت کی تعمیر وفلاح کے لیے جب میدان میں قدم رکھا تو کس ظلم وتشدد سے آپ کا خیر مقدم کیا گیا......اور دوسری طرف اس ظلم وتشدد اور مخالفتوں اور ذلیل قسم کی شرارتوں کے طوفان سے گزرتے ہوئے رسول پاکؐ نے کس سیرت وکردار کا مظاہرہ کیا"۔ [9]

نعیم صدیقی نے سیرت رسولؐ کے جس انقلابی پہلو کو اجاگر کیا ہے ان کے بارے میں سید اسعد گیلانی نے حضورؐ کے انقلابی اصولوں اور بعض عملی تدابیر کو ناگزیر قرار دیتے ہوئے آج کے دور میں حکمت سیاست وانقلاب کی تعیین کی بات کی ہے [10] اور ڈاکٹر خالد محمود نے نعیم صدیقی کی سیرت نگاری کے اسی پہلو کی تحسین کی ہے:

"بہ حیثیت مجموعی نعیم صدیقی کی یہ کتاب رسول کریم کو ایک ایسے عظیم انقلابی کی حیثیت سے پیش کرتی ہے جس کا لایا ہوا انقلاب انسانیت پر سب سے بڑا احسان ہے"۔ [11]

نعیم صدیقی کا کمال فن یہ ہے کہ وہ اپنے پرزور استدلال، زور بیان اور اسلوب کے طفیل قاری کو اس معرکۂ خیر وشر میں شریک کر لیتے ہیں جو قائد انقلاب کے دور میں جاری تھا اور قاری اسی دور میں خود کو شریک سمجھنے لگتا ہے، اسی اسلوب کی بات ڈاکٹر خالد محمود کرتے ہیں "نعیم صدیقی کی اس کتاب کے مطالعے سے نہ صرف آنحضرتؐ کی متحرک شخصیت کے دلآویز نقوش پردۂ ذہن پر ابھرتے ہیں بلکہ اپنے پرزور اسلوب بیان کی وجہ سے قاری کو اپنی رو میں بہالے جاتی ہے"۔ [12]

اسلوب ہی ادیب ہے، نعیم صدیقی کا موثر اسلوب ملاحظہ ہو، حضرت عمرؓ کے مسلمان ہونے کا واقعہ کہ جب وہ اپنی بہن کو اسلام قبول کرنے کی وجہ سے لہولہان کر دیتے ہیں تو: "ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے، رسول اللہ کی پیروی میں داخل ہو گئے، اب تو جو کچھ چاہے کر لے یہ نقش ہدایت ہمارے سینوں سے نہیں مٹ سکتا......خون میں نہائی ہوئی بہن نے ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ یہ

عزیمت مندانہ فقرہ کہا تو ہیرے کا جگر پھول کی پتی سے کٹ گیا"۔ [13]

سیرت رسول کا ذکر ملاحظہ ہو:

"سرور عالم کی زندگی......ایک بہتا دریا ہے، جس میں حرکت ہے، روانی ہے، کشمکش ہے، موج وحباب، سیپیاں اور موتی ہیں......اس دریا کا رمز آشنا ہونے کے لیے اس کے ساتھ رواں رہنا پڑتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سیرت کی بہت سی کتابیں پڑھ کر نادر معلومات ملتی ہیں لیکن ہمارے اندر تحریک پیدا نہیں ہوتی، جذبے انگڑائی نہیں لیتے، عزم وہمت کی رگوں میں نیا خون نہیں دوڑتا، ذوق عمل میں نئی حرارت نہیں آتی، ہماری زندگیوں کا جمود نہیں ٹوٹتا......وہ سوز وساز ایمان ہمیں نہیں ملتا جس نے ایک یتیم بےنوا کو عرب وعجم کی قسمتوں کا فیصلہ کرنے والا بنا دیا"۔ [14]

نعیم صدیقی نے سیرت کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا اور اسلوب بیان کے زور پر داعیانہ انداز میں یہ پیغام بھی دیا کہ سیرت رسول ہمیں داعیان حق اور دشمنان حق میں تمیز کرنا سکھاتی ہے اور معرکۂ خیر وشر میں ایسے کردار سامنے لانا سیرت نگاری کا اہم جز ہے، نہ صرف یہ بلکہ مولف سیرت پاکؐ کے عملی پہلوؤں پر زور دیتا ہے کہ سیرت کا اصل پیغام یہی ہے کہ:

"ہم محسن انسانیت کی دعوت کا احیا کریں، حضورؐ کے قائم کردہ خطوط پر تبدیلی احوال کے لیے جدوجہد کریں اور نظام عدل ورحمت کو ٹھیک اس عملی نقشہ پر استوار کریں جو قرآن کے اصولوں کو سامنے رکھ کر قائد انسانیت نے وضع کیا تھا، وقت آگیا ہے کہ ہم اور ہمارے نوجوان تہذیب حاضر کی مرعوبیت کا بوجھ سر سے اتار پھینکیں اور اس مادہ پرستانہ دور کے خلاف فکری بغاوت کا علم اٹھائیں، محمدؐ کی سیرت کو کتابوں کے صفحات سے نکال کر نئے سرے سے عملی زندگی کے اوراق پر رقم کریں"۔ [15]

نعیم صدیقی کی سیرت نگاری کا یہی انداز فکر اور اسلوب اسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے، ان کے اس نقطۂ نظر کو عالمی اسلامی تحریکوں میں جو پذیرائی ملی ہے اس سے "محسن انسانیت" کی

مقبولیت اور پذیرائی میں اضافہ ہوا ہے اور جوں جوں قارئین کا وژن وسعت اختیار کرے گا یہ سلسلہ وسیع تر ہوتا جائے گا۔

حواشی وحوالے

۱- سیرت النبیؐ (اول): مولانا شبلی نعمانی، ادارہ اسلامیات، لاہور ۲۰۰۲ء، ص ۳۲۔

۲- محسن انسانیتؐ: نعیم صدیقی، الفیصل، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۴۸۔

۳- ایضاً، (تقریظ)، ص ۲۸۔

۴- ایضاً، ص ۶۱۔

۵- ایضاً، ص ۵۲ و ۵۳۔

۶- ایضاً، ص ۳۴۔

۷- رسول انقلابؐ کا طریق انقلاب: ڈاکٹر اسرار احمد، مکتبہ خدام القرآن، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۱۸۔

۸- ماہ نامہ ''دعوۃ''، اسلام آباد، اپریل ۲۰۰۷ء، ص ۴۴ و ۴۵۔

۹- محسن انسانیتؐ، ص ۷۹۔

۱۰- رسول اکرمؐ کی حکمت انقلاب: سید اسعد گیلانی، ادارہ ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۸۱ء، ص ۱۳ و ۱۴۔

۱۱- اردو نثر میں سیرت رسولؐ: ڈاکٹر انور محمود خالد، اقبال اکادمی پاکستان، لاہور ۱۹۸۹ء، ص ۷۷۔

۱۲- ایضاً، ص ۷۶۔

۱۳- سید انسانیتؐ: نعیم صدیقی، الفیصل، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۵۴۔

۱۴- محسن انسانیتؐ، ص ۶۶۔

۱۵- ایضاً، ص ۶۳۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم

کچھ تاثرات ومشاہدات

پروفیسر ظفر الاسلام اصلاحی*

مولانا ضیاء الدین اصلاحی (۳؍جولائی ۱۹۳۷ - ۲؍فروری ۲۰۰۸ء) ممتاز عالم دین، نامور صاحب قلم اور تواضع وانکساری کے مجسم پیکر تھے، وہ دینی وعلمی خدمات اور ذاتی اوصاف کے اعتبار سے بڑے بلند مقام پر فائز تھے، تصنیف وتالیف کے میدان میں ان کا خاص امتیاز تھا، جس موضوع پر انہوں نے قلم اٹھایا اس کا حق ادا کردیا، علمی کاموں میں ان کے یہاں رواروی نام کی کوئی چیز نہیں تھی، ان کی تحریروں کو پڑھنے پر پہلا تاثر یہی ابھرتا ہے کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور زیر بحث موضوع کے بنیادی ماخذ تک ان کی بھرپور رسائی تھی، واقعہ یہ کہ ان کے وسعت مطالعہ، تحقیقی ذوق اور تصنیفی امتیازات میں طلبہ، اساتذہ اور اہل قلم سب کے لیے بڑا قیمتی سبق ملتا ہے، کسب علم، درس وتدریس، تصنیف وتالیف ان تمام کاموں سے تعلق رکھنے والوں کے لیے مولانا کی زندگی کا یہ درس بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ ان میں سے جس مصروفیت سے بھی تعلق ہو پوری سنجیدگی وانہماک کے ساتھ ہو۔ تب جا کر اس کا حق ادا ہوگا اور اس کے بہترین نتائج سامنے آئیں گے جن سے دوسرے بھی فیض یاب ہوں گے۔

مولانا مرحوم کی علمی خدمات کے بہت سے پہلو ہیں ان میں تصنیفی وتالیفی سرگرمیاں سب سے زیادہ نمایاں ہیں، ان کی تصانیف قرآن، حدیث، تعلیم، ہندوعرب تعلقات، تذکرہ وشخصیات، مختلف موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں، ان میں خاص طور سے ایضاح القرآن، تذکرۃ المحدثین،

* صدر شعبہ اسلامک اسٹڈیز، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

ہندوستان عربوں کی نظر میں، مسلمانوں کی تعلیم، مولانا آزاد-مذہبی افکار، صحافت، قومی جدوجہد، الاصلاح - ایک تعارف خاص طور سے قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ معارف کے اداریے (شذرات) وفیات اور تبصرے کی صورت میں انہوں نے جو فکر انگیز، معلوماتی و مفید تحریروں کا عظیم ذخیرہ چھوڑا ہے ان کی قدر و قیمت اپنی جگہ مسلم ہے۔

مولانا مرحوم کے علم و فضل اور علمی خدمات کے علاوہ ان کی شخصیت کا ایک اور (بلکہ سب سے زیادہ) قابل قدر پہلو وہ اوصاف و خصائص ہیں جن کا امتزاج علم و فضل، کسی عظیم منصب اور نام وری کے ساتھ کم ہی ملتا ہے یعنی انکساری، تواضع، خاکساری، سادگی، اعلیٰ ظرفی اور تصنع و تکلف سے دوری اور سب کے ساتھ کریمانہ برتاؤ، مولانا مرحوم نے اس باب میں ایسی مثال قائم کی ہے جس کے نقوش بہت گہرے ہیں اور بلاشبہ ان کی یاد تادیر باقی رہے گی، یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ مولانا پورے پچاس سال (۱۹۵۷-جنوری ۲۰۰۸ء) اس ادارہ (دارالمصنفین شبلی اکیڈمی) سے وابستہ رہے، جس سے معمولی انتساب وجہ شرف سمجھا جاتا ہے، ۲۰ برس اس بین الاقوامی شہرت کے حامل ادارہ کے سربراہ رہے اور اردو کے انتہائی قدیم و معیاری رسالہ "معارف" کے مدیر رہے، تقریباً گیارہ برس وہ مدرسۃ الاصلاح کے ناظم بھی رہے، اس کے علاوہ انہوں نے متنوع موضوعات پر بیش بہا کتابیں اور مقالے تصنیف کیے لیکن ان سب کے ساتھ انہوں نے عملی زندگی میں جس منکسرانہ مزاجی، متواضعانہ برتاؤ، شریفانہ اخلاق، سادہ رہن سہن اور تکلفات سے دوری کا مظاہرہ کیا وہ موجود دور کے مزاج کے لحاظ سے کچھ تعجب خیز معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ یہ مولانا کا امتیاز تھا، یہ باتیں میرے لیے سنی سنائی نہیں ہیں بلکہ بہت قریب سے مولانا کی زندگی کو دیکھنے کا موقع ملا تھا اور ان سے طویل عرصہ تک تعلقات و معاملات میں بہت سی باتیں ذاتی طور پر میرے علم میں آئیں، قرآن و حدیث سے مولانا کا بہت گہرا تعلق تھا، ان پر نہ صرف ان کی گہری نظر تھی بلکہ گراں قدر تصانیف بھی ہیں، میرا احساس ہے کہ قرآن و سنت سے گہری وابستگی کے فیض سے مولانا میں ان اوصاف حمیدہ کی نشو و نما ہوئی، اس لیے کہ قرآن و حدیث اپنے طالبین و حاملین سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ انسانیت کے اعلیٰ معیار کا مظاہرہ کریں اور اخلاق حسنہ و خصائل حمیدہ کا مجسم پیکر بن جائیں، واقعہ یہ کہ یہ وہ بہت قیمتی سبق

ہے جو مولانا مرحوم کی زندگی سے ملتا ہے، اسے یاد رکھنا اور اس سے فائدہ اٹھانا انہیں بہترین خراج عقیدت پیش کرنا ہوگا۔

مولانا مرحوم کی شخصیت کا ایک اور پہلو جس میں بڑوں کے لیے عبرت اور اہل علم کے لیے نصیحت ہے وہ ہے چھوٹوں پر شفقت، طلبہ کی حوصلہ افزائی اور نئے اسکالرس کی علمی سرپرستی، ابھرتے ہوئے اسکالرس کی تربیت و خوردوں کی صلاحیت نکھارنے میں مولانا کی دل چسپی اور ان کی فراخ دلانہ علمی سرپرستی کا فیض تھا کہ نہ معلوم کتنے لوگ صاحب قلم ہوگئے، مضمون نگار و مصنف بن گئے اور عہدہ و منصب پانے کے لائق ہوگئے، آج کی علمی دنیا میں ان اوصاف سے متصف ہونے والے بھی کم ہی ملتے ہیں، اللہ تعالیٰ مولانا مرحوم کو غریق رحمت کرے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔

علمی مشاغل اور انتظامی مصروفیات کے ساتھ مولانا کی زندگی کا ایک قابل قدر پہلو یہ بھی تھا کہ وہ قومی و ملی مسائل میں دلچسپی رکھتے تھے، حالات حاضرہ پر ان کی بڑی گہری نظر تھی اور مسلمانوں کی اجتماعی فلاح و بہبود کے مسائل پر غور و فکر کرکے صائب و سنجیدہ رائے ظاہر فرماتے تھے، انہوں نے اپنی قوت تحریر کو ان مسائل کی تشریح و تفہیم اور ان کے تجزیہ کے لیے بھی استعمال کیا، ان مسائل پر بہت سے مضامین کے علاوہ معارف کے "شذرات" (اداریے) اس کا منہ بولتا ثبوت ہیں، معارف میں ان کے اداریے حسب روایت تین چار حصوں میں منقسم ہوتے تھے، ان میں سے ایک دو (اور بعض اوقات پورے اداریہ میں) ملک و ملت کا کوئی نہ کوئی اہم مسئلہ ضرور زیر بحث آتا تھا، مسلم پرسنل لا، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، مسلمانوں کا مذہبی و تہذیبی تشخص، دینی مدارس، مسلمان و عصری تعلیم، مسلمانوں کی سماجی و اقتصادی ترقی، ملک کے جمہوری نظام حکومت میں اقلیتوں کے حقوق، فرقہ وارانہ فسادات، ہندو مسلم اتحاد، قومی یک جہتی، ملک میں رونما ہونے والے سیاسی انقلابات جیسے مختلف النوع اہم مسائل پر مولانا کے فکر انگیز اداریے معارف کے صفحات میں محفوظ ہیں، یہاں یہ ذکر اہمیت سے خالی نہ ہوگا کہ مولانا کی زندگی میں شائع ہونے والے آخری شمارۂ معارف (جنوری ۲۰۰۸ء) کا اداریہ ایک انتہائی اہم مسئلہ (ہندوستانی مسلمانوں کے مذہبی و ثقافتی تشخص کی بقا و تحفظ) سے تعلق رکھتا ہے، یہ پوری تحریر ان کے ملی درد

اور اس مسئلہ کے تئیں ان کی فکر مندی کی آئینہ دار ہے، اس مسئلہ کے حل کے لیے انہوں نے جس بات کی دعوت دی ہے وہ انتہائی سنجیدگی سے غور کی طالب اور لائق توجہ ہے، مولانا کے خیال میں اس ملک میں مسلمانوں کے تشخص کے تحفظ کی ذمہ داری سب سے پہلے اور سب سے زیادہ خود مسلمانوں پر عاید ہوتی ہے نہ کہ حکومت یا کسی اور پر، انہوں نے مسلمانوں کو اس نکتہ پر بڑے ٹھنڈے دل سے غور وفکر کی دعوت دی کہ جب وہ خود اسلامی روایات کو ایک ایک کر کے اپنی زندگی سے نکالتے جارہے ہیں اور غیروں کی روایات کو گلے لگا رہے ہیں تو ان کے تشخص کے کمزور ہو جانے یا خطرہ میں پڑ جانے کے لیے حکومت کو ذمہ دار قرار دینا کہاں تک صحیح ہوگا، یہ لمحہ فکریہ ہے کہ جب اسلامی تعلیمات وروایات پر عمل کے باب میں مسلمان خود بے پرواہ ہو گئے ہیں یعنی ان کے تشخص کی داخلی قوت کمزور ہو گئی ہے تو بیرونی سہارے یہ کب تک باقی رہ سکتا ہے، مولانا کے اس اداریہ کا پہلا حصہ خود ان ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں تو اس کی قدر وقیمت مزید واضح ہو جائے گی، وہ تحریر فرماتے ہیں:

> ''ہندوستان جیسے ملکوں میں مسلم اقلیت کے تشخص کا مسئلہ بہت اہم ہوتا ہے مسلمان اس کے لیے عموماً حکومت کو مورد الزام قرار دیتے اور اپنے کو کسی طرح کا ذمہ دار نہیں سمجھتے حالاں کہ ان کے قومی وملی تشخص کے ختم ہونے اور ان کی شناخت میں ان کے اپنے رویہ کا زیادہ دخل ہے کیوں کہ وہ خود ہی اپنی تہذیب وروایات سے دست بردار ہوتے جاتے ہیں اور اسلام کے احکام وہدایات پر عمل نہیں کرتے جو ان کے تشخص کی پہچان اور ضامن ہوتی ہیں، مخالف اسلام اعمال وکردار کے مرتکب ہو کر اسلام کی ایسی قبیح اور بدنما تصویر پیش کرتے ہیں جس کا ان کی اصل پہچان سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، اسلام انہیں جن اعلا اوصاف وخصوصیات کا حامل بنانا چاہتا ہے ان سے وہ کورے دکھائی دیتے ہیں، فساد وبگاڑ کے جن جراثیم کا نام ونشان بھی ان کی زندگی میں نہیں ہونا چاہیے تھا جن کو مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا وہ ایک ایک کر کے ان میں پیدا ہو گئے ہیں اور ان کے اسلامی وصف وامتیاز کو غارت کر رہے ہیں۔ جو چیزیں ان کے ملی وجود اور

> اسلامی تشخص کے لیے سم قاتل تھیں وہی ان میں پھل پھول رہی ہیں اور جن اعمال کا شائبہ بھی ان کی زندگی میں نہیں ہونا چاہیے تھا وہ ان میں اس طرح سے رچ بس گئے ہیں کہ ان کی پہچان وشناخت معدوم ہو گئی ہے اس میں سارا عمل دخل ان کا اپنا ہے اس کے لیے کسی کو ذمہ دار قصوروار نہیں کہا جا سکتا''۔ (معارف، شذرات، جنوری ۲۰۰۸ء، ص ۲)

اس اداریہ کے بقیہ حصے میں مولانا مرحوم نے ان خرابیوں اور برائیوں کی نشان دہی کی ہے جو مسلمانوں کی مذہبی وسماجی زندگی میں در آئی ہیں۔ اس بگڑی ہوئی صورت حال کا احساس دلاتے ہوئے انہیں زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلامی تعلیمات وروایات پر پوری طرح عمل پیرا ہونے کی دعوت دی ہے اس لیے کہ اسی پر اصلاً ان کے مذہبی وملی تشخص اور تہذیبی شناخت کی بقا منحصر ہے، آخر میں مولانا نے انبیاء کرام علیہم السلام کے اسوہ اور قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں برادران اسلام کو اولاد کی صحیح تعلیم وتربیت کی جانب متوجہ کیا ہے اس لیے کہ جدید دور میں خاص طور سے نئی نسلیں اسلامی طرز زندگی کو چھوڑ کر غیر قوموں کی ثقافت وکلچر اختیار کرتی جارہی ہیں۔

مسلمانوں کے اجتماعی مسائل میں تعلیم کے مسئلہ میں مولانا کافی دل چسپی رکھتے تھے اپنی تقریر وتحریر میں اسی موضوع پر اظہار خیال پسند فرماتے تھے، وہ نظام تعلیم کی دوئی یا تعلیم کی دینی ودنیوی خانوں میں تقسیم کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، قدیم نظام تعلیم کے تحفظ واستحکام کو ضروری تصور کرتے تھے اور مدارس کو اسلام کے قلعہ سے تعبیر کرتے تھے لیکن اس تعلیم کی افادیت بڑھانے کے لیے اس کے ساتھ کچھ عصری تعلیم کو مناسب وضروری سمجھتے تھے یعنی وہ عصری تقاضوں کے تحت قدیم وجدید تعلیم میں امتزاج کی ضرورت واہمیت تسلیم کرتے تھے، وہ تعلیم نسواں کے باب میں بڑی متوازن رائے رکھتے تھے حدود کے اندر لڑکیوں کی تعلیم کو بھی ضروری قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کی اپنی شخصیت کی تعمیر کے علاوہ اولاد کی تعلیم وتربیت اور دین کی تبلیغ واشاعت کی ضرورت کے نقطۂ نظر سے بھی ان کی تعلیم کا اہتمام بھی ضروری ہے، ایک جانب مسلمانوں کے لیے دینی تعلیم کی بنیادی اہمیت وضرورت، دوسری جانب عصری تعلیم کی افادیت اور موجودہ دور میں اس کی بڑھتی ہوئی طلب، اس صورت حال نے مسلمانوں کے لیے بہت سے مشکل تعلیمی مسائل پیدا

کر دیے ہیں، مولانا مرحوم نے اپنے ایک مبسوط مقالہ ''مسلمانوں کی تعلیم۔ مسائل و مشکلات اور ان کا حل'' (شائع شدہ مجلہ علوم اسلامیہ جلد نمبر ۲۴۔ ۲۵/ ۲۰۰۴ء۔ ۲۰۰۶ء) میں ان مسائل و مشکلات کا بڑی گہرائی سے جائزہ لیا ہے اور ان کے حل کے لیے مناسب و مفید تجاویز بھی پیش کی ہیں، یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ مولانا کی آخری مطبوعات میں ان کی ایک اہم کتاب ''مسلمانوں کی تعلیم'' (شائع شدہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ، ۲۰۰۶ء) شامل ہے، اس کتاب کی ترتیب و تکمیل و طباعت کے محرک اصلاً مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق مولانا مرحوم کے وہ مقالات تھے جو انہوں نے شعبہ اسلامک اسٹڈیز کے توسیعی خطبات اور دوسرے پروگراموں میں پیش کیے تھے جیسا کہ مصنف گرامی نے مقدمہ میں بھی اس کا ذکر کیا ہے، اس کے مباحث میں اسلام میں علم کی اہمیت، اسلام کے ابتدائی دور میں تعلیم و تربیت کی روایات، مروجہ نظام تعلیم، دینی مدارس کی اہمیت و ضرورت، دینی تعلیم کے ساتھ سائنسی تعلیم کی ضرورت و افادیت، اسلام اور تعلیم نسواں، مدارس دینیہ اور دعوتِ دین کے تقاضے اور علامہ شبلی کے تعلیمی افکار و نظریات خاص اہمیت کے حامل ہیں، مولانا کی یہ وقیع تصنیف ان کے وسعتِ مطالعہ، تحقیقی ذوق، مسلمانوں کے قدیم و جدید تعلیمی نظام اور اس کے مسائل پر گہری نظر اور ان کے وسیع تصور علم کی واضح شہادت دے رہی ہے۔

مختصر یہ کہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کی ذاتی و علمی زندگی مختلف پہلوؤں سے قابل قدر اور وجہ عبرت ہے، محقق، مصنف، مدیر اور ایک عظیم ادارہ کے سربراہ کی حیثیت سے انہوں نے بڑے گہرے نقوش چھوڑے ہیں اور ایک مومن صالح کی حیثیت سے جو بہترین عملی مثالیں قائم کی ہیں ان میں ہر ایک کے لیے بہت کچھ سبق ملتا ہے، اللہ تعالیٰ انہیں مغفرت و رحمت سے نوازے، جنت الفردوس میں انہیں اعلیٰ مقام نصیب کرے اور ان کے پسماندگان و متعلقین کو صبر کی توفیق عنایت کرے، اللھم اغفر وارحم وانت خیر الراحمین۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ
نقوش و تاثرات

ڈاکٹر خلیل الدین شجاع الدین

ابھی چند ماہ قبل زمانہ حج ۱۴۲۸ھ (دسمبر ۲۰۰۷ء) ہی کی تو بات ہے جب محترم مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب سے مکہ معظمہ کی سرزمین پر نہایت مبارک ایام میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور یہ ملاقات رابطہ عالم اسلامی کے ایک پروگرام میں شرکت کے لیے ہم رکابی کی صورت میں سامنے آئی، رابطہ کی اس تقریب کے موقع پر حرم شریف سے رابطہ عالم اسلامی تک محترم مولانا کے ساتھ جانا ہوا اور یہ سب کچھ جناب ابرار احمد اصلاحی صاحب کی ایما پر ہوا۔

ملاقات کی تفصیل اس طرح ہے کہ راقم تحریر حرم کلینک میں موجود اپنے مریضوں کی مصروفیت میں سے کچھ وقت نکال کر کسی طرح حرم کی کار پارکنگ تک پہنچ جاتا ہے جہاں چند حضرات راقم کے منتظر تھے، چار پانچ افراد پر مشتمل اس قافلے میں شیروانی میں ملبوس ایک انتہائی باوقار شخصیت پر احقر کی نگاہیں مرکوز ہوتی ہیں اور مختصر تعارف پر علم ہوتا ہے کہ آپ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ کے ڈائرکٹر اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے ناظم محترم مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب ہیں، محترم مولانا سے خط و کتابت اور مراسلت کا سلسلہ گذشتہ تقریباً دو دہائیوں سے تھا لیکن آج پہلی بار مولانا سے ملاقات کا شرف حاصل ہو رہا تھا۔

حج کے دوران حرم شریف کے اطراف کثرت ازدحام اور مختلف دشواریوں کی بنا پر رابطہ عالم اسلامی تک جانے کے لیے ایک طویل راستے (حرم مکی، عزیزیہ جنوبی، مستشفیٰ نور اور سوق الحجاز سے ہوتے ہوئے رابطہ کے دفتر تک) کا انتخاب کیا گیا، تاکہ کسی رکاوٹ کے بغیر آسانی سے منزل تک پہنچا جا سکے، تقریباً نصف گھنٹہ کی اس مسافت میں محترم مولانا سے کئی اہم موضوعات پر گفتگو

عیادۃ الحرم، الحرم المکی الشریف، پوسٹ بکس نمبر ۱۶۴۴، مکۃ المکرمہ۔

ہوئی جس میں خصوصاً دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا قیام کن حالات میں ہوا؟ ہندوستان میں مسلمانوں کا مستقبل؟ اور فلاح و کامیابی کی راہیں؟ مسلم پرسنل لا بورڈ کی خدمات اور عالم اسلامی میں رابطہ عالم اسلامی مکۃ المکرمہ کا کردار وغیرہ وغیرہ جیسے اہم عنوانات پر محترم مولانا نے روشنی ڈالی۔

چند لمحات بعد ہمارا قافلہ رابطہ عالم اسلامی کے شاندار کانفرنس ہال میں داخل ہو رہا تھا، رابطہ کے سالانہ اجلاس کی یہ افتتاحی تقریب تھی، جس میں گورنر مکہ امیر خالد الفیصل بن عبدالعزیز آل سعود، مفتی اعظم سعودی عربیہ عبداللہ عبدالعزیز آل شیخ اور رابطہ عالم اسلامی کے سکریٹری جنرل ڈاکٹر عبداللہ محسن الترکی اسٹیج پر جلوہ افروز تھے، رابطہ کا آڈیٹوریم مہمانوں سے بھرا ہوا تھا لیکن پروگرام شروع ہونے میں ابھی مزید کچھ وقت درکار تھا، احقر کی نگاہوں نے یہ مشاہدہ کیا کہ اتنی دیر میں بھی مولانا چند صفحات کے مطالعہ میں مصروف ہیں۔

عام طور پر اہل علم کی معیت میں یہی مکرر سبق ملتا ہے کہ ایک مومن کو زندگی کے ایک ایک لمحہ کا استعمال کس طرح کرنا چاہیے، اس کی ایک مثال مولانا بھی تھے۔

رابطہ کے پروگرام کے اختتام پر ابرار احمد اصلاحی صاحب کے دولت خانہ پر کھانے کا نظم کیا گیا تھا، جس میں نیویارک امریکا میں موتمر العالم الاسلامی کے نمائندے جناب ڈاکٹر ملک سردار خان صاحب، لکھنؤ یونی ورسٹی میں شعبہ عرب کلچر کے ڈاکٹر عبیداللہ فراہی صاحب، دہلی سے شعبہ آثار قدیمہ کے ڈاکٹر فیضان احمد صاحب، جامعہ ام القری مکۃ المکرمہ سے یونس اعظمی قاسمی صاحب، محترم مولانا ضیاء الدین صاحب کے ساتھ ٹھہرانے میں شریک تھے، اس مختصر مجلس میں بھی مولانا نے عالم اسلامی کے مختلف اہم مسائل پر اپنے گراں قدر خیالات و مفید مشوروں سے مجلس میں موجود تمام حضرات کو مستفید ہونے کا موقع عنایت کیا۔

حرم مکی شریف کی جانب واپسی کے دوران احقر نے محترم مولانا کی یاددہانی کی کہ ممبئی میں ایم بی بی ایس میں طالب علمی کے دوران راقم سطور نے دنیا کے کئی مشاہیر سے مقصد حیات کے تعلق سے ایک مشترک سوال کیا تھا تو اس وقت آپ کی خدمت میں بھی یہ سوال نامہ بھیجا گیا تھا کہ آپ کی نگاہ میں ایک انسان کا مقصد حیات کیا ہونا چاہیے؟

احقر نے مزید وضاحت کی کہ محترم مولانا آپ کا جواب بھی موصول ہوا تھا، جس میں

آپ نے انسان کے مقصد حیات کے تعلق سے اپنے خالق و مالک اللہ سبحانہ تعالیٰ کے سامنے مکمل طور پر خود سپردگی اور (وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ) کی تفسیر پیش کی تھی، مولانا نے یہ گفتگو سن کر انتہائی خوشی کا اظہار کیا، نیز اس خط کی تاکید کے طور پر یہ فرمایا کہ ”رب العالمین کے سامنے مکمل طور پر خود سپردگی ہی ہمارا اصل مشن و مقصد حیات ہے“۔

حج بعد محترم مولانا اور دیگر مہمانوں کے ساتھ مشاعر مقدسہ مثلاً منیٰ، مزدلفہ، عرفات، مسجد خیف، مسجد مشعر الحرام، مسجد نمرہ، مسجد جن، جنت المعلی، شعب ابی طالب، جبل ثور، جبل نور وغیرہ کی زیارتوں کا اتفاق ہوا اور برصغیر کے ایک ممتاز و جید عالم دین کی زبانی ان تمام تاریخی و مقدس مقامات کی فضیلتوں و برکات سے متعلق معلومات میں مزید اضافہ ہوا۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحبؒ کے سامنے جب بھی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا تذکرہ آیا تو راقم حروف نے یہ واضح طور پر محسوس کیا کہ محترم مولانا نے حضرت مولانا علی میاں ندویؒ کا انتہائی احترام و محبت سے ذکر کیا بلکہ حضرت مولانا کے متعلقین سے بھی آپ کی محبت کا اظہار ہوتا تھا، اس طرح بڑوں کے نزدیک اپنے بڑوں کی تکریم و اکرام کس انداز سے ہوتا ہے اس کی جھلک مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ کی گفتگو سے واضح طور پر عیاں تھی۔

ایک دن راقم محترم مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ کی خدمت میں ان کی حرم شریف سے قریب محلہ اجیاد میں واقع قیام گاہ پر ملاقات کی غرض سے جا رہا تھا کہ ایک نومسلم ڈاکٹر سنجے پانڈے (موجودہ صالح کریم) بھی ساتھ ہو لیے، تعارف پر مولانا نے صالح کریم کے حق میں بہت دیر تک دعائیں کیں اور قبول اسلام پر دلی مبارک باد بھی دی اور اس ضمن میں یہ تلقین کی کہ ”دنیا حق کی تلاش میں ہے اور ہمارا فرض اولین ہے کہ دوسروں تک ہم حق کی دعوت اور توحید کا پیغام پہنچاتے رہیں“۔

مولانا مرحومؒ کے مشفقانہ مزاج کو دیکھ کر راقم سطور نے مولانا کی خدمت میں اپنے مختلف شائع شدہ مضامین کا مجموعہ پیش کیا تو ازراہ عنایت چند کلمات بھی مزید ہمت افزائی کے لیے تحریر فرما دیے جو انشاء اللہ مستقبل میں مجموعہ مضامین ”نقوش حرم“ کی اشاعت کے موقع پر قارئین کی خدمت میں پیش کر دیے جائیں گے، البتہ فی الحال مولانا کی تحریر کے آغاز میں سفر حج سے مربوط کچھ حصہ ذکر کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں اور کچھ بعید نہیں کہ حج کے بعد مکۃ المکرمہ

میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی یہ آخری تحریر ہو، مولانا نے اپنی اس تحریر کا عنوان تجویز کیا تھا ''ڈاکٹر خلیل الدین شجاع الدین کی دریافت'' یہ قارئین کے استفادہ کی خاطر پیش کی جارہی ہے:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

۱۴۲۸ ہجری میں اللہ تعالیٰ نے پھر اپنے فضل وکرم سے ایک بار میرے حج بیت اللہ کا سامان کیا تو میں نے طے کیا کہ اس فریضہ کو اپنے بل بوتے ہی پر انجام دوں گا، دوسروں سے آسانی اور سہولت طلب کرنے سے حتی الامکان احتراز کروں گا۔

احسانِ غیر اور سفرِ منزلِ حبیب ہے ننگ جستجو جو چلوں راہبر کے ساتھ

اس لیے اپنے سفر کو بڑی حد تک مخفی رکھنے کی کوشش کی مگر اس میں کامیابی نہیں ملی، چنانچہ جب سرزمین حرم پہنچا تو حج کے لیے آنے والے اور یہاں پہلے سے مقیم میرے بہت سے دوستوں اور ہم مدرسہ بھائیوں کو پتہ لگ گیا تھا اور وہ میری قیام گاہ پر ملنے اور آرام پہنچانے کے خیال سے آنے لگے۔

ہمارے ایک ہم مدرسہ دوست ڈاکٹر ابرار اصلاحی عرصے سے مکہ میں مقیم ہیں، یہ رابطہ عالم اسلامی سے منسلک اور اس کے انگریزی جریدہ کے ایڈیٹر ہیں، وہ جانتے تھے کہ میں ٹیلی فون نہیں رکھتا اس لیے انہوں نے ہمارے رفیق سفر ڈاکٹر سراج الدین لکچرر شبلی کالج اعظم گڈھ کے ٹیلی فون پر مجھے اور میرے تمام رفقائے سفر کو رابطہ عالم اسلامی کے ایک پروگرام میں جو حج کے موقع سے ہر سال ہوا کرتا ہے شرکت اور اپنے یہاں کھانے پر مدعو کیا۔

ڈاکٹر ابرار صاحب نے فرمایا کہ آنے جانے میں کوئی زحمت نہیں ہوگی کیوں کہ مجھے اور میرے ساتھیوں کو لانے اور واپس لے جانے کی ذمہ داری ڈاکٹر خلیل الدین شجاع الدین صاحب نے بڑی خوشی سے قبول کرلی ہے، میرے لیے ڈاکٹر صاحب کا نام بالکل نامانوس تھا، اگر ان کی دریافت کو اپنے حج کی برکت کہوں یا ان کی ملاقات مسیحا و خضر سے بہتر کہوں تو بے جا نہ ہوگا، ایسی برکت کے ملنے میں ابرار احمد اصلاحی صاحب کا دخل ہے اس لیے ان کا بھی شکر گزار ہوں۔

ہم لوگ جب ڈاکٹر خلیل الدین شجاع الدین صاحب کی گاڑی پر بیٹھے تو معلوم ہوا کہ وہ مسجد حرام کی پہلی منزل پر حرم کلینک میں فروکش ہوکر مریضوں کو دوائیں دیتے اور ان کا علاج کرتے اور اپنی مسیحائی سے انہیں تندرستی اور توانائی بخشتے ہیں، ان کی رہائش گاہ جدہ میں ہے،

رات میں کسی وقت وہاں جاتے اور صبح کو حرم آپہنچتے ہیں، ڈاکٹری کا پیشہ خود بہت ہی مبارک اور وسیلہ خدمت ہے لیکن ضیوف الرحمان اور حجاج کی خدمت، خبر گیری اور دوا علاج ایسی نعمت خداداد ہے جس کے متعلق یہی کہا جاسکتا ہے کہ

ایں سعادت بہ زور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ڈاکٹر صاحب نے مجھے بتایا کہ قریباً بیس برس پہلے ان کے ایک استفسار کے جواب میں اس ناچیز نے انہیں جو خط لکھا، وہ ان کے پاس محفوظ ہے، مزید بتایا کہ ان کا اصل وطن بھیونڈی ہے اور وہ راقم کے لائق دوست جناب خلیل الدین شجاع الدین (ایڈیٹر تعمیر حیات و بانگ درا) کے برادر خورد ہیں، ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی بتایا کہ وہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور ان کے جانشین مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب سے انسیت کے لیے یہی باتیں کافی تھیں مگر انہوں نے چند ہی مختصر ملاقاتوں میں میرے قلب و ذہن پر اپنی محبت، خلوص اور شرافت و اخلاق کے جو نقوش چھوڑے ہیں وہ کسی طرح محو نہیں ہوسکتے، دراصل قدرت کی بارگاہ فیض سے انہیں بڑا دردمند اور بے قرار دل ملا ہے، اس لیے وہ برابر جذبہ خدمت سے سرشار رہتے ہیں، چنانچہ میری اور میرے دوسرے رفقائے سفر کی دل جوئی مدارات اور دوا علاج میں ہر وقت مستعد رہتے، کسی نہ کسی بہانے ہماری خبر گیری کے لیے قیام گاہ پر پہنچ جاتے یا ٹیلی فون سے خیریت معلوم کرلیتے، حج کا ازدحام کم ہوا تو ہم سب کو اپنی گاڑی سے مقدس مقامات کی سیر کرائی۔

ڈاکٹر صاحب بہت عدیم الفرصت ہیں، ایام حج میں ان کی مشغولیت بہت بڑھ جاتی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑی ہمت و قوت اور گونا گوں صلاحیتیں بخشی ہیں، اس لیے ان کی حرکت اور عملی قوت میں کوئی کمی نہیں آتی اور وہ ہر وقت جوش عمل اور ذوق خدمت سے سرشار دکھائی دیتے ہیں، حیرت ہوتی ہے کہ ایسی شدید مشغولیت، پیشہ ورانہ مصروفیت اور مریضوں میں گھرے رہنے اور روز جدہ و مکہ کو ایک کردینے کے باوجود وہ کب لکھنے پڑھنے کے لیے وقت نکال لیتے ہیں، ان کی زندگی کے ان مختلف الجہات پہلوؤں کو دیکھ کر بے ساختہ علامہ شبلی کا وہ قول یاد آجاتا ہے جو انہوں نے مولانا حسرت موہانی کی متضاد اور طرفہ تماشا طبیعت کی بنا پر ان کی نسبت فرمایا تھا کہ ''تم آدمی ہو کہ جن''۔

ڈاکٹر صاحب کی طبی حذاقت ومہارت اور جوش خدمت تو مسلم ہے لیکن ان کی تحریری و صحافتی خدمات بھی کم اہمیت کی حامل نہیں، ان کے جو مضامین کئی برسوں سے مختلف جرائد ورسائل میں چھپتے رہے ہیں وہ اس قدر مقبول ہوئے کہ دوسرے کئی رسالوں نے ان کو نقل کیا اور دوسری زبانوں میں ان کے ترجمے بھی ہوئے، ڈاکٹر صاحب نے اظہار خیال کے لیے اردو اور انگریزی زبانوں کو اپنا ذریعہ بنایا ہے، ان پر وہ اچھی قدرت رکھتے ہیں، ان ہی کی طرح ان کی تحریریں بھی بے تکلف اور تصنع اور بناوٹ سے خالی ہوتی ہیں، جن میں روانی اور برجستگی کے ساتھ ہی جاذبیت اور تاثیر ہوتی ہے۔

اسلام کی دعوت وتبلیغ اور اس کی ترجمانی واشاعت ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا مقصد اور مشن ہے اور وہ اسلام اور مسلمانوں کی سربلندی کے آرزومند ہیں، اس کے لیے ان کے پاس ایک ہی نسخہ ہے کہ مسلمان اپنے قلب وروح کی بالیدگی اور ایمان ویقین میں اضافے کے لیے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑیں اور رسول اکرم ﷺ کی سیرت مبارکہ اور آپ کے اسوۂ حسنہ کو اپنا نمونہ بنائیں، ڈاکٹر صاحب کے تمام مضامین دینی ودعوتی رنگ کے موثر، سبق آموز اور از دل خیزد بر دل ریزد کے مصداق ہیں، مجھے یہ معلوم کر کے بڑی مسرت ہو رہی ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے مضامین کا مجموعہ افادۂ عام کے لیے شائع کر رہے ہیں، میری دعا ہے کہ جس خلوص اور دردمندی سے یہ مضامین لکھے گئے ہیں انہیں اسی مخلصانہ جذبے سے پڑھا جائے اور ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا جائے۔

ضیاء الدین اصلاحی

مولانا کے یہ کلمات سفر حج میں یکسوئی، دلجمعی اور اخلاص کے غماز ہیں، البتہ ایک مشک بار کی مشک کی خوشبو چھپ نہیں سکتی، چنانچہ شناساؤں، شیدائیوں اور قدردانوں نے مولانا کی حاضری سے فائدہ اٹھایا اور اس زمرہ میں راقم سطور بھی اللہ تعالیٰ کے فضل سے شامل ہو گیا۔

قابل رشک موت: مولانا کے انتقال کے بعد تعزیت کی غرض سے راقم نے جب مولاناؒ کی ہندوستان میں اعظم گڈھ کی رہائش گاہ پر ٹیلی فون سے گفتگو کی تو آپ کے چھوٹے صاحب زادے سلیم جاوید، جو دار المصنفین شبلی اکیڈمی میں لائبریرین ہیں، ان سے یہ تفصیلات معلوم ہوئی کہ یکم فروری کو پھریہا کے پاس مولانا کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا، پسلیاں وغیرہ بڑی حد تک متاثر ہوئیں تھیں اور چہرہ پر ایک زخم ہو گیا تھا جس سے مستقل خون بہہ رہا تھا، مولانا کو اسی

نازک حالت میں اعظم گڈھ سے بنارس علاج کے لیے لے جانے کا پروگرام طے کیا گیا، ڈھائی گھنٹوں کے اس سفر میں مولاناؒ مکمل ہوش میں رہے اور کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ مستقل زبان پر جاری رہا، بنارس میں ڈاکٹروں نے چہرے پر لگے زخم کو درست کرنے کی نیت سے داڑھی کو قینچی سے تراش خراش کرنا چاہا لیکن صورت حال ایسی ہوئی کہ اس سے قبل کہ داڑھی کا کچھ حصہ بھی تراشا خراشا جاتا، مولاناؒ کی روح قفس عنصری سے آزاد ہو کر رب العزت کے دربار کی جانب پرواز کر گئی اور اللہ سبحانہ تعالیٰ کو شاید یہی منظور تھا کہ ایک جید وممتاز عالم دین جس کی ساری زندگی قال اللہ و قال الرسول اور امر بالمعروف والنھی عن المنکر میں گزری ہو، انتقال کے وقت سنت رسول اللہ ﷺ ہی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو۔

حج کے بعد ابھی چند دن ہی تو گزرے تھے، حادثہ کے بعد مستقل کلمہ طیبہ کا زبان پر جاری ہونا، علم دین کی اشاعت وترویج میں ساری زندگی اور ملت کے مسائل میں مستقل تگ ودو، بے شک مولاناؒ نے ایک قابل رشک ہی موت پائی ہے۔

آخری آرام گاہ: ۳؍جنوری ۲۰۰۸ء کو حج بعد آپ کی جدہ سعودی عربیہ سے ہندوستان کے لیے واپسی تھی اور ٹھیک ایک ماہ بعد ۳؍فروری کو آپ کی تدفین دار المصنفین شبلی اکیڈمی میں عمل میں آئی، جہاں حضرت علامہ شبلی نعمانیؒ اور نامور صاحب قلم جناب سید صباح الدین عبدالرحمانؒ بھی مدفون ہیں، اسی جگہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحبؒ کی بھی آخری آرام گاہ طے پائی۔

۳؍فروری کو آپ کی تدفین ہوئی اور اسی دن راقم حروف حرم مکی شریف میں حالت طواف میں محترم مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ کے حق میں دعا میں مصروف تھا کہ بے ساختہ ذہن میں سورۂ فاطر کی آیت نمبر (۲۸) آ گئی کہ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ غَفُوْرٌ (ترجمہ: اللہ سے اس کے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے ہیں واقعی اللہ تعالیٰ زبردست بڑا بخشنے والا ہے)۔

اللہ مولاناؒ کو غریق رحمت کرے اور مکۃ المکرمہ میں آپ کی کی گئی آخری نصیحتوں میں سے چند ایک یعنی ”اسوۂ رسول اکرم ﷺ پر مکمل عمل اور اللہ رب العالمین کے سامنے مکمل خود سپردگی پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہم سبھوں کو عمل کی توفیق عنایت فرمائے۔ (آمین)

اخبار علمیہ

شارجہ یونی ورسٹی کے شعبہ شریعت ومطالعات اسلامی کے ڈین شیخ عبدالناصر ابوالبصر کے زیرنگرانی قطر اور شارجہ میں دوایسے باغ لگائے جائیں گے جن میں صرف وہی پودے اگائے جائیں گے جن کا ذکر قرآن مجید اور احادیث نبوی ﷺ میں موجود ہے، اس کے لیے مسلم علما اور ماہرین علم نباتات کی ایک بین الاقوامی کمیٹی بھی بنائی گئی ہے، اس قرآنی باغ کے پودوں کی نشوونما، پرورش وپرداخت کا کام دوحہ میں قائم یونیسکو کا دفتر انجام دے گا۔

مصر کی سرکاری خبر رساں ایجنسی Mena نے وزیر اطلاعات انس الفقیکی کے حوالہ سے اطلاع دی ہے کہ حکومت مصر نے جرمنی کے رسالہ ''ڈرسپیگل'' کے ۲۵ رمارچ کے خصوصی شمارے کو ضبط کرنے کا حکم اس لیے دیا ہے کہ اس میں رسول اللہ ﷺ کی توہین آمیز شبیہ اور شان کریمی میں گستاخانہ الفاظ استعمال کیے گئے ہیں اور اس کے سرورق پر ''اللہ مغرب میں'' شہ سرخی لگائی گئی اور ایک جرمن مستشرق کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اسلام انتہا پسندی اور دہشت گردی کا قائل ہے، وزیر اطلاعات نے کہا کہ ہم بلاشبہ آزادی ذرائع ابلاغ کے حق میں ہیں لیکن کسی مذہب کی اہانت ہمارے نزدیک قطعاً ناقابل برداشت ہے۔

مرکز جمعۃ الماجد کے آرگن ''اخبار المرکز'' کی خبر کے مطابق ادارہ کے نمائندہ ڈاکٹر عمار امین الدولہ نے ترکی کے شہر قونیہ کی ان متعدد لائبریریوں کا دورہ کیا جو بیش قیمت اور نادر مخطوطات کا مخزن ہیں، رپورٹ کے مطابق ۱۷۹۵ء میں قائم مکتبہ یوسف آغا میں ۳۱۸۵ مخطوطات اور ۱۸۱۶ قدیم عثمانی مطبوعات محفوظ ہیں، مکتبہ متحف مولانا جلال الدین رومی میں ۴ ہزار، مکتبہ عزت قویوں اوغلو میں ۵ ہزار مخطوطات ہیں جن میں ایک ہزار صرف عربی میں ہیں، مکتبہ جامعۃ الالٰہیات میں ۳سو نادر مخطوطات ہیں، اس کے علاوہ انہوں نے استنبول کے متعدد علمی مراکز اور کتب خانوں مکتبہ سلیمانیہ، مکتبہ بایزید، مکتبہ ارشیف عثمانی، مرکز البحوث الاسلامیہ، موتمر اسلامی کے زیرنگرانی کام کررہا ہے اور مبحث الآثار الاسلامیہ والترکیہ کی بھی زیارت کی اور باہمی ثقافتی تعاون کی سبیلوں پر گفت وشنید کی۔

۱۸۷۰ء میں بیروت سے ''الجنان'' نامی پندرہ روزہ علمی، ادبی اور سیاسی مجلہ شائع ہوتا

تھا، اس کے مشمولات اپنی کیفیت وکمیت کے لحاظ سے اہم ہوتے تھے اور اس زمانے میں پورے عرب خطے میں اس کی دھوم تھی، مشہور لبنانی مفکر ومحقق بطرس البستانی (۱۸۱۹ء-۱۸۸۳ء) نے اس کو جاری کیا تھا، ان کا شمار انیسویں صدی کے جدید عربی ثقافت کے اہم ارکان اور ادیبوں میں ہوتا ہے، اس کے علاوہ نفیر سوریہ، الجنۃ اور الجنینہ نامی رسالے بھی انہوں نے شائع کیے تھے، بطرس البستانی کی اصل شہرت ان کی تالیف محیط المحیط اور دائرۃ المعارف کی وجہ سے ہے، ان کی وفات کے بعد ان کے فرزند ارجمند سلیم البستانی اور پھر نجیب البستانی نے یہ بار گراں اپنے کندھے پر اٹھایا، تاہم ۱۸۸۷ء تک الجنان نکل سکا، اس کے بعد کسی سبب سے بند ہوگیا، اس کے نمایاں قلم کاروں میں شیخ ابراہیم یازجی، سلیمان بستانی اور ادیب اسحاق وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

سعودیہ کے ایک ماہ نامہ ''المستقبل الاسلامی'' کی خبر کے مطابق جنوبی براعظم امریکہ کے ملک برازیل کی کل آبادی ۱۴۵ ملین ہے، مسلمان ایک کروڑ ہیں اور ان کی ۲۵ مسلم تنظیمیں کام کررہی ہیں، ان میں ایک تنظیم ابوبکر صدیق ہے، اس کی دعوتی وتبلیغی کوششوں کے نتیجہ میں برازیل کے ۵ ہزار سے زیادہ نوجوانوں نے اسلام قبول کیا ہے، ایک دینی قائد ڈاکٹر احمد صفی کا بیان ہے کہ برازیل کے ہر صوبہ میں ایک بڑی مسجد ہے، قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس ملک میں افریقی مسلمانوں کا ایک قافلہ ۱۸۳۵ء میں باھیا نامی خطے میں فروکش ہوا تھا، شروع شروع میں مسلمان عیسائیوں کے ڈر سے شعائر اسلامی پر برملا عمل پیرا نہیں ہوپاتے تھے مگر اب غیر مسلم افراد مذہب اسلام کی حقانیت سے متاثر ہوکر اس کے آب زلال سے خود کو سیراب کررہے ہیں۔

شاہ عبدالعزیز میوزیم کے سکریٹری فہد السماری کے زیرنگرانی حج انسائی کلوپیڈیا پروجیکٹ شروع ہونے والا ہے، جس کا افتتاح ریاض کے گورنر شہزادہ سلمان بن عبدالعزیز کریں گے، فہد السماری کا بیان ہے کہ اس انسائی کلوپیڈیا میں فریضہ حج پر مذہبی، سماجی، ثقافتی اور اقتصادی زاویہ سے نگاہ ڈالی جائے گی اور دوران حج استعمال ہونے والے راستوں کی مکمل تفصیلات کی تاریخی دستاویزات کے علاوہ تصویریں اور نقشے وغیرہ بھی اس انسائی کلوپیڈیا میں شامل ہوں گے اور مورخین ومحققین کے تاریخی بیانات اور حجاج کرام کے تجربات ومشاہدات بھی اس قاموس کے صفحات کی زینت بنیں گے۔

اخبار علمیہ

عیسائی مذہبی رجحانات پر مشتمل ''کرسچین رپورٹ'' کے تازہ شمارے میں یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ برطانیہ میں عیسائی عبادت گزاروں کی تعداد مسلمان عابدوں کے مقابلہ گھٹتی جارہی ہے، اس جائزے میں کہا گیا ہے کہ اگر موجودہ رجحان یعنی چرچ کی جانب عدم توجہ برقرار رہا تو ۲۰۲۰ء تک اتوار کے دعائیہ اجتماع میں شریک ہونے والوں کی تعداد کم ہوکر ۶۷۹۰۰۰ ہوجائے گی اور مسجد میں مسلمانوں کی تعداد ۶۸۳۰۰۰ ہوجائے گی۔

چین کے صوبہ ژنیانگ شانکسی میں تقریباً ۴؍انچ لمبے پروں والی بلی پائی گئی ہے، اس بلی کے مالک گرینی فنگ کا کہنا ہے کہ اس بلی کے پر فطری طور پر ظاہر ہوئے، پروں کی نشوونما کے لیے الگ سے کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے۔

ورجینیا یونی ورسٹی کے محققین کے مطالعہ کے نتیجہ میں یہ بات سامنے آئی ہے کہ موسم کی آلودگی پھولوں سے ان کی خوشبو چھین کر انہیں کاغذی پھولوں کی طرح بنارہی ہے جو بے مہک ہوتے ہیں، ان کی تحقیق کے مطابق اس کا اثر صاف طور پر تتلیوں اور شہد کی مکھیوں میں یہ دیکھا جارہا ہے کہ پہلے وہ پھولوں کی خوشبو کے سبب ان سے بہرہ ور ہوتی تھیں، تاہم اب وہ پھولوں کے پاس جانے سے کترا رہی ہیں، مگس تو بالخصوص دنیا کے متعدد حصوں سے غائب ہورہی ہیں، تحقیق کے مطابق کم آلودہ خطوں میں بوئے گل ایک ہزار سے ۱۲ سو میٹر تک پھیلتی ہے لیکن موجودہ آلودہ فضاؤں میں یہ دوری سمٹ کر دو سے تین سو میٹر تک محدود ہوجاتی ہے، جس کے سبب تتلیوں اور دوسرے خوشبو پسند کرنے والے کیڑوں کے لیے پھولوں تک پہنچنا مشکل ہوتا جارہا ہے، بعض دوسری تحقیقات میں کسانوں کا یہ بیان بھی نقل ہوا ہے کہ شہد کی مکھیاں اور تتلیاں حالیہ چند برسوں میں غائب ہوتی جارہی ہیں، سائنس داں کہہ رہے ہیں کہ پٹرولیم ایندھن سے ہونے والی آلودگی اس کی اصل ذمہ دار ہے۔

''چائنا فلورشنگ پیریڈ'' کے نام سے دنیا کا پہلا سونے کا اخبار جاری کیا گیا ہے، ابھی اس کے صرف دو شمارے منظر عام پر آئے ہیں، اخبار کا وزن ۵۰۰ گرام ہے اور اس کی قیمت ۸۳۰۰ ڈالر ہے، ایک شمارہ ۲۰۰۵ گرام وزنی ہے جس کی قیمت ۳۵۰۰ ڈالر ہے، رپورٹ میں اس کے ایڈیٹر پبلشر اور صفحات کی تعداد کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔

ک۔ص اصلاحی

جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحبؒ کی وفات

تعزیتی تجاویز اور خطوط

2245, 61 Street, Brooklyn,
New York-11204 (U.S.A.)

بہ خدمت عالی اشتیاق احمد ظلی صاحب
مدیر ماہنامہ ''معارف''، اعظم گڈھ

محترمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

افسوس کہ میں خود علیل ہونے کے باعث مولانا ضیاء الدین اصلاحی مرحوم کے سانحۂ ارتحال پر بروقت تعزیت کرنے سے قاصر رہا، البتہ اس اندوہناک خبر پر میں نے مرحوم کے فرزند سلیم جاوید سے فون پر تعزیت کا اظہار کردیا تھا، اس سے پہلے کہ میں تحریری طور پر تعزیت کرتا میں خود سخت بیمار ہوگیا، مورخہ ۱۲؍فروری ۲۰۰۸ء کو مجھے اچانک پے در پے دوبار ہارٹ اٹیک ہوگیا جس کے بعد اوپن ہارٹ سرجری کے عمل سے گزرنا پڑا، اب مکمل آرام کی ہدایت ہے، اس لیے خط نہیں لکھ سکا، جہاں تک مولانا مرحوم کی ذات بابرکات کا سوال ہے ان کی ہستی دارالمصنفین کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام اہل علم کے لیے فیض رساں کی حیثیت رکھتی تھی، ان کی وفات حسرت آیات سے جہانِ علم و تحقیق میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے وہ کبھی پُر نہیں ہوسکے گا، ہم آج خود کو یتیم محسوس کررہے ہیں، میرا اور میرے اہل خانہ کا مرحوم سے عقیدت مندانہ تعلق کم وبیش ۳۵ سال پر محیط ہے، میں ان کی عالمانہ اور مدبرانہ عظمت کا معترف ہوں اور نازاں بھی کہ مرحوم مجھ پر بہت مہربان تھے، مجھ سے شفقت فرماتے تھے اور ہر اچھے برے موقع پر مجھے یاد کرلیا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں مخصوص مقام عطا فرمائے اور پس ماندگان کو صبر جمیل کے ساتھ ساتھ ان کا سچا جانشین ہونے کی توفیق عطا فرمائے، آمین ثم آمین۔

میں نے حج بیت اللہ سے ان کی واپسی پر انہیں فون پر مبارک باد دی تھی اور اس وقت ان سے خاصی گفتگو ہوئی تھی لیکن کیا خبر تھی کہ مذکورہ گفتگو ان سے میری آخری گفتگو ثابت ہوگی اور وہ

اچانک داغ مفارقت دے جائیں گے۔

خیر یہ وہ منزل ہے جہاں ہر انسان قطعی مجبور ہے، صبر اور دعا کے سوا کچھ بھی اختیار میں نہیں، ہم ان کی مغفرت کے لیے دعاگو ہیں اور ادارے کے تئیں اپنی مخلصانہ خدمات کا یقین دلاتے ہیں، ان کی مغفرت کی دعا کے ساتھ ہی ہم ان کی اہلیہ محترمہ کی سلامتی پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں اور ان کی درازیٔ عمر کی دعا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ قبول فرمائے، آمین۔

فقط سوگ وار
عبدالوہاب خاں سلیم

مچھلی پٹنم
۱۵/مارچ

برادر عزیز سلمہ اللہ وعافاہ (محمد عارف عمری اعظمی)

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

میں اپنے بڑے لڑکے کے ہاں امریکہ گیا ہوا تھا، ٹھیک ساڑھے پانچ ماہ وہاں رہا، ۱۲/ فروری کو بہ خیر وعافیت واپس ہوا فالحمدللہ۔

یہاں آکر سنا کہ مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی موٹر کار کے حادثے میں زخمی ہو کر رحلت فرما گئے، اناللہ، ایک تو اس لیے کہ وہ ایک عالم دین تھے، دوسرے وہ دارالمصنفین کے ناظم تھے، معارف کے مدیر تھے، میرے مخلص اور کرم فرما تھے، ان باتوں سے ان کی ناگہانی موت اس دور افتادہ کو بڑا رنج دے گئی، اللہ اپنے دین کے اس خادم ضیاء الدین کو اعلا علیین میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر جمیل دے اور ان کا کفیل بنے، آمین۔

میں نے مرحوم پر ایک مقالہ لکھا ہے جو مئی ۰۸ء کے ”راہ اعتدال“ میں نکلے گا ان شاء اللہ۔

بشرطِ فرصت اطلاع دیجیے کہ بزم شبلی وسلیمان کے ناظم اور معارف کے مدیر اب کون ہیں؟ اللہ اس ادارے کو اپنے حفظ وامان میں لے اور رکھے۔

سبھی رفقا کی خدمت میں سلام مسنون عرض کریں۔

والسلام، دعا خواہ
محمد ثناء اللہ عمری

ادارۂ ترجمہ وتالیف
کولکتہ
۴/۲/۲۰۰۸ء

محترمی ومکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اخبار آزاد ہند اور راشٹریہ سہارا کولکاتا مورخہ ۳/فروری ۲۰۰۸ء سے معلوم ہوا کہ مولانا

ضیاء الدین اصلاحی کا کار کے حادثے میں سانحہ ارتحال پیش آگیا۔

اس قحط الرجال میں ان جیسے عالم محقق، دانش ور اور خوش اخلاق مسلمان کی جدائی ملت کا عظیم خسارہ ہے، میں آپ کے اور دارالمصنفین کے دوسرے رفقا کے لیے دعا گو ہوں کہ آپ حضرات کو اس غم پر اجر عظیم عطا فرمائے۔

اور ان کی وفات سے جو جگہ خالی ہوئی ہے آپ سب مل کر اسے پُر کریں، آمین ثم آمین۔

مولانا مرحوم نے والد صاحب مرحوم مولانا ابوسلمہ شفیع احمدؒ پر مفصل مضمون ان کی فن حدیث پر تحریر فرمایا تھا جو ملک کے موقر رسالوں میں شائع ہوا، ان شاء اللہ اسی مضمون کو معارف کے لیے جلد ارسال کروں گا، تاکہ معارف میں شائع ہو سکے۔

تمام احباب کی خدمت میں سلام ومسنون۔

والسلام مع الاکرام
طلحہ بن ابوسلمہ ندوی

ادارۂ معارف اسلامی
کراچی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

جناب عبدالمنان ہلالی صاحب/محمد طارق صاحب

امید ہے آپ ایمان وصحت کی بہترین حالت میں ہوں گے۔

روزنامہ ”جسارت“ کراچی میں یہ افسوس ناک خبر پڑھی کہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب اب ہم میں نہیں رہے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب کی وفات نہ صرف ان کے اہل خانہ بلکہ رفقا اور نیازمندوں کے لیے بھی دکھ اور افسوس کا باعث ہے، انہوں نے اپنی شعوری زندگی میں تحریر وتحقیق اور دعوت و تحریک کا جو بھی کام کیا ہے اسے یقیناً بھلایا نہ جاسکے گا، وہ نہ صرف شبلی اکیڈمی، مدرسۃ الاصلاح اور ندوۃ العلما (لکھنؤ) کا قیمتی اثاثہ تھے بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے بھی اک سرمایہ کی حیثیت رکھتے تھے، جریدہ ”معارف“ کے مقاصد کو فروغ دینے اور تحقیقی کام کو آگے بڑھانے میں انہوں نے اپنے پیش رو جلیل القدر صاحبان سید سلیمان ندویؒ، شاہ معین الدین ندویؒ اور سید صباح الدین عبدالرحمانؒ جیسے محققین اور اسکالرز کی پیروی کی۔

ہماری دعا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان کی عملی وعلمی کاوشوں کو قبول فرمائے، اللہ تعالیٰ آپ کو،

ان کے اہل خانہ کو اور تمام رفقا اور نیاز مندوں کو یہ دکھ سہنے کا حوصلہ دے اور ہم سب کو اس بات کی توفیق دے کہ ہم مولانا مرحوم کی طرح اپنی زندگی کو عملی اور علمی کاموں کے لیے وقف کردیں۔ (آمین)

سید شاہد ہاشمی
(ایگزیکٹو ڈائریکٹر)

اردو ماہ نامہ "حیات"
پرانا قلعہ روڈ، دہلی
۲۶/۲/۲۰۰۸ء

محترم عمیر الصدیق صاحب

آداب

یہ جان کر انتہائی دکھ ہوا کہ قابل قدر اسکالر جناب ضیاء الدین اصلاحی صاحب کا ایک حادثہ میں انتقال ہوگیا، دانشوری جن لوگوں سے حقیقی معنوں میں منسوب ہے، ضیاء الدین اصلاحی صاحب ان میں سے ایک تھے، علم و تحقیق کے شعبہ کو ان کے انتقال سے جو شدید نقصان پہنچا ہے، اس کی بھرپائی ناممکن ہے۔

برائے کرم میرے اور ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کی قیادت کی جانب سے ان کے اہل خانہ، رشتہ داروں اور رفقائے کار تک ہماری دلی تعزیتیں پہنچادیں۔ نیک خواہشات کے ساتھ

بندۂ خلوص
شمیم فیضی

28 Alden House, Duncan Road,
London E8 4RA, UK
۲۲ فروری ۲۰۰۸ء

جناب ڈاکٹر عبدالمنان ہلالی صاحب
جوائنٹ سکریٹری، شبلی اکیڈمی، اعظم گڈھ

مکرمی و محترمی!   السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مخدومی مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ کے ناگہانی حادثۂ انتقال کی خبر ایسی نہیں جو ذہن سے آسانی سے محو ہوسکے، مولانا مرحوم کا دارالمصنفین سے رشتہ نصف صدی پر محیط رہا ہے، جس کے دوران ان کے قلم سے کتنے ہی مقالات "معارف" کی زینت بنے اور متعدد تصنیفات منصۂ شہود پر

آئیں، اللہ تعالیٰ مرحوم کی خدمات قبول فرماتے ہوئے انہیں بہترین صلہ سے نوازے، مولانا مرحوم کا سانحۂ ارتحال صرف دارالمصنفین کا نقصان نہیں بلکہ تمام وابستگان دبستان شبلی اور اس سے بڑھ کر پوری علمی دنیا کا خسارہ ہے، ابھی ہم یکے از دبستان شبلی اور دارالمصنفین کے سابق رفیق مولانا مجیب اللہ ندوی کی رحلت کا غم بھلا نہ پائے تھے کہ ایک دوسرا چرکا لگا، بہرحال یہ مشیت الٰہی ہے جس کے آگے سرتسلیم خم کردینا ہمارے ایمان کا تقاضا ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات ہم انسانوں سے بے نیاز ہے، اسے جس سے جس قدر کام لینا ہوتا ہے اتنا کام لینے کے بعد وہ اس کا باب حیات بند کردیتا ہے، اس میں کوئی استثنا نہیں ہے۔

مولانا مرحوم مجھ پر بڑی شفقت فرماتے تھے، کم و بیش ہر سفر میں مرحوم سے ملاقات کے لیے ضرور حاضر ہوتا تھا، ۲۰۰۶ میں مولانا سے ملاقات کے لیے جب حاضر ہوا وہ اس وقت تصنیفی کام میں مصروف تھے، مجھے دیکھ کر لکھنا موقوف کیا اور گفتگو کرنے لگے، اس خیال سے کہ مولانا کا زیادہ وقت ضائع نہ ہو، میں مختصر ملاقات کے بعد اٹھنے لگا تو فرمایا اگر جلدی نہ ہو تو اور بیٹھو، مجھے کیا ٹال ہوسکتا تھا، اس ملاقات میں مولانا نے بعض موضوعات پر تفصیل سے باتیں کیں، کیا معلوم تھا کہ یہ مرحوم سے آخری سے ملاقات ہے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی لغزشوں سے صرف نظر کرتے ہوئے انہیں اپنی جوار خاص میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبر و حوصلہ عطا کرے، اگر آپ میری جانب سے مرحوم کے پس ماندگان تک میری تعزیت پہنچا سکیں تو میں بہت ممنون ہوں گا، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کی اہلیہ کو صحت عطا کرے اور انہیں یہ غم سہنے کا حوصلہ عطا کرے۔

آپ کے ساتھ میں بھی اس دعا میں شریک ہوں کہ دارالمصنفین کو ان کا نعم البدل عطا ہو جو اس عظیم علمی ادارے کو اوج و کمال کی نئی جہتوں سے روشناس کرائے، براہ کرم محترمی عمیر صدیق ندوی اور برادرم کلیم صفات اصلاحی نیز دیگر حضرات تک میرا اسلام اور تعزیت دونوں پہنچادیں، ممنون ہوں گا، اہلیہ بھی تعزیت پیش کرتی ہیں۔

والسلام
رضوان احمد فلاحی

ادبیات

تھے ضیاء الدین اصلاحی ادیب باوقار

ڈاکٹر احمد علی برقی اعظمی

تھے ضیاء الدین اصلاحی ادیب باوقار — جن کی تصنیفات ہیں اردو ادب کا شاہکار

تھے معارف کے ایڈیٹر ناظم اصلاح بھی — گلشن شبلی میں ان کی ذات تھی مثل بہار

تھی وہ پہلی فروری جب شومیٔ تقدیر سے — ناگہاں اک حادثے کے ہوگئے تھے وہ شکار

زندگی اور موت کی جاری تھی پیہم کشمکش — چھوڑ کر سب کو بالآخر چل بسے وہ سوگوار

شبلی کالج بھی ہے اس غم میں برابر کا شریک — غم زدہ سلمان سلطاں، مضمحل ہیں افتخار

ان کو الیاس اعظمی سے تھا جو اک فطری لگاؤ — اس لیے وہ فرط غم سے ہیں مسلسل اشک بار

ساکت وصامت ہیں رفقا شبلی منزل کے سبھی — فرط غم سے ان کا بھی ناگفتہ بہ ہے حال زار

تھی عظیم المرتبت ان کی مثالی شخصیت — یاد ہے لوگوں کو اب تک ان کا عجز وانکسار

ان کی عملی زندگی تھی پیکر مہر و وفا — تھے ہمیشہ ہر کسی کے خیر خواہ وغم گسار

شبلی منزل کی تھیں رونق ان کی بزم آرائیاں — یاد آئیں گی جو ارباب نظر کو بار بار

مختصر سی نظم میں ان کا احاطہ کیا کریں
ان کے تھے احمد علی ادبی محاسن بے شمار

ذاکر نگر، نئی دہلی۔

مطبوعات جدیدہ

موضوعات خطبات اقبال: ترجمہ وتشریح: محمد شریف بقا، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات: ۱۸۲، قیمت: ۲۵۰ روپے، پتہ: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۱۶ میکلوڈ روڈ، لاہور۔

علامہ اقبال کے پیام اور شاعری کی تشریح وتبلیغ میں کمی یا کوتاہی کا شکوہ بے جا ہے، برصغیر میں ان کے کلام سے جس قدر اعتنا کیا گیا اس کی نظیر میں صرف غالب کو پیش کیا جا سکتا ہے، غالب کو یک گونہ امتیاز یہ بھی حاصل ہے کہ ان کی نثر بھی محققین غالب کا محبوب موضوع رہی، علامہ اقبال کے مداحوں کا یہ شکوہ ایک حد تک درست ہے کہ اقبال کی نثر کو وہ مرتبہ حاصل نہیں ہوا جس کا وہ اس لیے حق دار ہے کہ ان کی نثر، فلسفہ، فکر اور تدبر سے لبریز ہے، اس لیے اس کا مطالعہ بھی مفید اور فکر انگیز ہے، علامہ کے خیالات کی وسعت اور گہرائی گو ان کے اشعار میں کم نہیں لیکن ان کی نثر میں مزید گہرائی اور غواصی کے امکانات اور زیادہ ہیں، نثر اقبال کے ذکر سے ذہن فوراً ان کی کتاب تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کی جانب منتقل ہوتا ہے جس کے متعلق یہ تاثر قطعی بجا ہے کہ یہ ان کے فکر ونظر کی معراج اور ان کی عمیق ذہنی کیفیات کا عکس تمام ہے، لیکن یہ بھی درست ہے کہ موضوع کی گراں باری اور غوامض کی کثرت سے شاعری کے برخلاف ان کی تفہیم خواص کے لیے بھی آسان نہیں، یہی وہ ضرورت تھی جس نے زیر نظر کتاب کے فاضل شارح کو اس کتاب کے مندرجات کی تسہیل کے لیے آمادہ کیا، چنانچہ انہوں نے اس فریضے کو اس طرح ادا کیا کہ کتاب کے افکار کو ترتیب وار درج کر کے موضوعات کو حروف تہجی کے اعتبار سے قلم بند کیا، جیسے آئین سازی، اجتہاد، اسلام، اشاعرہ، باطن، بقا، تصوف، تقدیر، توحید، جسم وجاں، جلال وجمال، خدا، خودی، دور حاضر، دین وسیاست، روحانیت، زماں، زندگی، سائنس، سرمایہ داری، شعور، صوفی، عقل وخرد، علم، فراریت، وحی والہام، یوروپی فلسفہ وغیرہ اور پھر ہر عنوان کے تحت خطبات میں

جہاں جہاں ان موضوعات کا ذکر ہے، ان کے اقتباسات کو جمع کیا اور پھر سادہ زبان میں ان کی تشریح کردی، تشریحات بجائے خود شارح کے علم اور فکر کی غماز ہیں، بلاشبہ علم اقبال کی تبلیغ کی اس کوشش میں انفرادیت ہے اور خطبات اقبال کو سمجھنے کے لیے افادیت بھی ہے۔

نقوش سیرت: از مولانا سید محمد رابع ندوی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات: ۲۰۸، قیمت: درج نہیں، پتہ: مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹، ندوۃ العلما، لکھنؤ۔

رسول اکرم ﷺ کی حیات طیبہ کے متعلق اگر صرف اردو زبان کی کتابوں اور مضامین و خطبات کا ذکر ہو تو یہ بے حد و بے شمار ہیں، تاہم آپؐ کے ذکر کی تازگی اور حلاوت ہر پیرایے میں لطیف تر اور لذیذ تر ہی نظر آتی ہے، یہی کیفیت اس مجموعہ مضامین کی ہے، مختلف موقعوں پر فاضل مصنف نے حسب توفیق اپنے مطالعہ سیرت کی چند جھلکیاں پیش کیں، جب ان جوہر پاروں کو یک جا کیا گیا تو فاضل مصنف کے مطالعے کی بابرکت جہت اور ان کے سادہ لیکن نہایت موثر اسلوب نے مطالعہ سیرت کے ان نقوش کو تابانی بخش دی، معاشرے کی اصلاح، انسانیت دوستی، اسلام کے طریقہ دعوت و تبلیغ، سیرت و اخلاق کی تعمیر، ادبی بلاغت اور کلام نبوی میں دعا اور مناجات کے شہ پاروں جیسے موضوعات نے سیرت نبویؐ کا مطالعہ اور آپؐ کی سیرت کی اقتدا کرنے والوں کے لیے کچھ اور افق وا کردیے، آیات کی تشریح بھی البیلے انداز میں کی گئی، بناوٹ سے پرہیز مولانا ندوی کی ہر تحریر کی خوبی ہے، ان کا قلم فطری اور دیانت دار ہے، مولانا کا انکسار بھی دوسروں کے لیے نمونہ ہے کہ ''میں نہیں کہہ سکتا کہ میرے یہ مختلف النوع مقالات اس اہمیت کے ہیں کہ ان کو مجموعے کی شکل میں پیش کیا جاسکے لیکن موضوع کی بلندی اور برکت کو دیکھتے ہوئے یہ میرے لیے سعادت کی بات ہے''۔

اصحاب علم وفضل: از جناب محمد تنزیل الصدیقی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات: ۲۷۲، قیمت: مفت، پتہ: ندوۃ المحدثین، گوجراں والہ، پاکستان۔

قاضی احتشام الدین مرادآبادی، سید ابوتراب رشد اللہ راشدی سندھی، مولانا رفیع الدین شکرانوی، حسرت عظیم آبادی، شاہ سلیمان پھلواروی اور مولانا حکیم سید ابوحبیب دسنوی وغیرہ علما

کا یہ تذکرہ معلومات اور طرز بیان کے لحاظ سے ایک اچھی پیش کش ہے، تاہم ان مختلف ذوق و مزاج کے حامل بزرگوں کے انتخاب کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی، یقیناً اسلاف کی خدمات کا ذکر اخلاف کے لیے ولولہ انگیز ہوتا ہے، یہ مقصد بھی قدر کے لائق ہے کہ اس قسم کی کوششوں سے عصر حاضر کی توجہ فن رجال کے ذخیرے میں اضافے کی جانب ہو، مولف کی یہ کاوش ایک سعی پیہم کا حصہ ہے، اس سے تذکرہ وسوانح میں ان کی دس کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے، ''اصحاب علم وفضل''، ''ارباب علم وخرد''، ''افراد حکمت ودانش'' ان کی چند کتابوں کے نام ہیں لیکن بہتر ہوتا ہے کہ علم و فضل کی چیدہ شخصیتوں کا مطالعہ اور تذکرہ ایک ترتیب سے ہوتا۔

۱- تاریخ علوی اعوان، مشہور بہ علوی اعوان تاریخ کے آئینے میں: از جناب محبت حسین اعوان، بڑی تقطیع، کاغذ وطباعت عمدہ، صفحات: ۷۸۰، قیمت: ۶۰۰ روپے۔ **۲- اعوان تاریخ کے آئینے میں:** متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات: ۱۸۶، قیمت: ۱۷۵ روپے۔ **۳- اعوان اور اعوان گوتیں:** متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، مجلد، صفحات: ۲۴۴، قیمت: ۱۸۰ روپے۔ (تینوں کتابوں کے ملنے کا پتہ: ادارہ تحقیق الاعوان، پاکستان، ۵۰۸، یونی شاپنگ سنٹر، عبداللہ ہارون روڈ، صدر کراچی، پاکستان)

پاکستان میں اعوان قبیلہ یا برادری کے ذکر سے ہندوستان والے بھی کچھ آشنا ہیں لیکن اس قبیلے کی تاریخ سے کم ہی واقفیت ہے، مذکورہ بالا تینوں کتابوں میں قدر مشترک مصنف اور موضوع ہے جن کے ذریعہ اعوان کی تاریخ اور خود ان کی تاریخ نویسی کی تاریخ مرتب ہوگئی ہے، اعوان اصلاً علوی سادات ہیں، برصغیر میں یہ اعوان خطاب سے سرفراز ہوئے اور پھر یہی خطاب ان کی شہرت کا ایسا سبب بنا کہ علوی نسبت بھی دب کر رہ گئی، یہ محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آئے جن میں امیر سالار ساہو، میر قطب حیدر کو اولیت کا درجہ حاصل ہے، یہ قطب شاہ کے نام سے بھی مشہور ہوئے، ان کی اولاد قطب شاہی اعوان کہلاتی ہے اور یہی موجودہ اعوان کے جد امجد ہیں، اب بھی اس قوم میں عربی فضائل وخصائص کا وجود ہے، یہ تینوں کتابیں اسی اجمال کی تفصیل ہیں، تینوں میں ان کے اجداد، ہندوپاک کے مختلف صوبوں میں ان کا وجود، ان کی

شناخت، ان کے علما و مشائخ اور حد یہ ہے کہ ان کی تمام گوتوں کی تفصیل جو "الف" سے "یا" تک ہر حرف سے شروع ہوتی ہیں، ان سب کا اہتمام ان تینوں کتابوں کے تنہا مولف کی حد درجہ تلاش و تحقیق اور محنت و جستجو کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کی تاریخ کے اس باب سے دل چسپی کی قدر بھی بڑھ جاتی ہے، خاص طور سے موخر الذکر کتاب کی تفصیلات تو حیرت انگیز ہیں، برصغیر میں اسلام اور مسلمانوں کی برادریوں اور علم الانساب سے تعلق اور دل چسپی رکھنے والوں کے لیے یہ تینوں کتابیں مفید و معاون ثابت ہوسکتی ہیں۔

نعتیہ شاعری میں ہیئتی تجربے: از جناب علیم صبا نویدی، متوسط تقطیع، کاغذ و کتابت عمدہ، صفحات: ۱۳۶، قیمت: ۳۰۰ روپے، پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی، علی گڑھ، ممبئی۔

جناب علیم صبا نویدی نے ٹامل ناڈ میں اردو کی بزم سخن اس شان سے سجا رکھی ہے کہ اردو کی اپنی خاص بستیوں کے لیے جنوب ہند کا یہ خطہ لائق رشک بن گیا ہے، علم و ادب کی مسلسل خدمت، مختلف اصناف میں بے شمار کتابوں کی تصنیف و تالیف کا ان کا جوہر، حیرت کا سبب ہے، زود نویسی اور بسیار نویسی کے باوجود ان کا ہر ادبی و تحقیقی کام قارئین کو شاد کام ہی کرتا ہے اور اس کی ایک مثال زیر نظر کتاب ہے جس میں صنف نعت کی ایسی ہیئتوں کا شمار ہے جن میں سے بعض کے نام سے کم کو واقفیت ہے، نعتیہ مرثیہ، شہر آشوب، قصیدہ، مناجات، نوحہ، مسدس، مخمس، سلام، رباعی، قطعہ، نظم پابند اور آزاد دونوں، نثری نظم، تین سطری نثری نظم، سانیٹ، ترائیلے، ہائیکو، واکا، آزاد غزل، ماہیا، دوہا، گیت، لوری، ترو ینی، کہہ مکرنی، چوبولے، ثلاثی، کجری یعنی ہر معلوم اور نا معلوم ہیئت میں نعتیہ شاعری کے تجربوں کی یہ تلاش واقعی قابل داد ہے، اس پر مستزاد ان ہیئتوں کی فنی خوبیوں، سیاق و سباق کا تعارف ہے، دو اور تحریریں بھی عام اردو داں طبقے کے لیے جدت لیے ہوئے ہیں یعنی عرب ٹمل زبان کی ابتدا اور اس زبان کے قصائد اور دکنی شعری ادبیات کے تاریخی و تحقیقی ادوار کا مکمل جائزہ، یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ یہ کتاب اردو ادب میں ایک وقیع اضافہ ہے۔

ع-ص